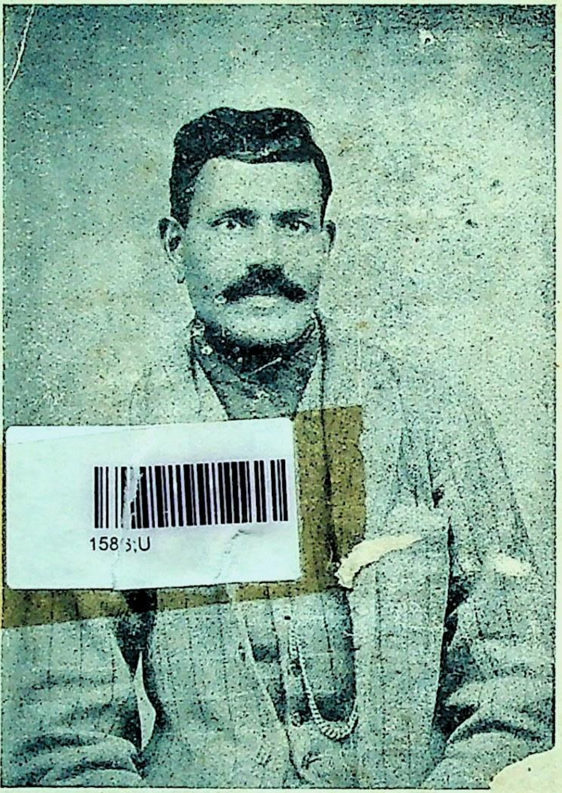
فلسفۂ نجات یا گیتا کا تتّو



ڈاکٹر چونی لال جین

پبلشرز شری کرشن گپتا بک ڈپو لاہور چوک گمٹی بازار

شریمد بھگوت گیتا کا تتو

المعروف

فلسفہ نجات

مصنفہ ڈاکٹر چونی لعل صاحب جین

مصنف فلسفہ اعتدال اور فلسفہ اتحاد وغیرہ

جسکو

شری کرشن کتابیک ڈپو چوک گمٹی بازار لاہور

نے

مفید عالم جنتری پرنٹنگ پریس بیرون موری گیٹ لاہور میں باہتمام پنڈت موہن لال

چھپواکر شائع کیا

باردوم   تعداد ۱۰۰۰   قیمت فی جلد ۹ر

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
تمہید	۴
دیباچہ	۸
بھگوت گیتا کے مطالعہ کی ضرورت	״
بھگوت گیتا کیا ہے؟	۱۰
بھگوت گیتا کا مہتو	۱۱
بھگوت گیتا کی نسبت غلط فہمی	۱۴
طریقہ علاج	۱۷
گیتا کا تتو المعروف فلسفہ نجات	۲۱
حصہ اول	۲۲
ابتدائی باتیں (رنجیدہ کا آغاز)	״
ارجن کے اعتراضات	۲۳
بھگوان کا جواب	۲۴
ارجن کا دوبارہ اعتراض	״
بھگوان کرشن کا اپدیش	۲۷
(۱) زندگی و موت کی حقیقت	״

مضمون	صفحہ
(۲) سکھ دکھ کی اصلیت	۳۰
(۳) حق و باطل کی ماہیت	۳۴
ذات حق یعنے روح کے اوصاف	۳۸
(۴) دھرم ادھرم کی تعریف	۴۴
بھگوت گیتا کے مضامین کی تقسیم	۵۲
یوگ کا مہتو	۵۴
یوگ کا تتو	״
یوگ کا ادھکاری	۵۶
یوگ کی تعریف	۶۰
یوگ کا کرم سے اعلےٰ درجہ ہے	״
نجات یافتہ کا وصف	۶۱
مکتی کا سادھن	۶۲
یوگ کا دشمن	۶۳
جیون مکت (الجھا خواہشات)	۶۶
״ جذبات	״

بلحاظ خیالات	۶۶
" اعمال	"
یوگ کا راز	"
ضبط حواس کی ضرورت	۶۷
ضبط خیال کی ضرورت	"
اہل کمال کے اوصاف	۶۸
یوگی کی طرز زندگی (۱) فردی حیثیت میں	۶۹
قومی حیثیت میں	"
وصال حق	۷۰
حصہ دوم	۷۲
امرت ساگر	"
دہرم شاستر اور پرم دہرم شاستر	۷۳
دہرم کا تنقیہ	۷۹
(ا) حواس کا اثر (صداقت پر)	۸۳
(ب) جذبات نفسانی کا اثر "	۸۴

توہمات باطلہ کا اثر	۸۷
برہم وچار	۹۶
برہم آچار	۹۹
تقسیم دوگانہ	۱۰۳
" چہارگانہ	۱۰۴
کرم یوگ	"
بھگتی یوگ	۱۰۸
گیان یوگ	۱۱۴
یوگ شاستر	۱۱۹
پریم گتی یا معراج اشرف	۱۲۲
مکتی کا سچا سروپ	۱۲۴
گیتا کی تعلیم کا نچوڑ	۱۳۴
(۱) ادہکاری	"
(۲) تعلیم	"
بندۂ دنیا	۱۳۶
دیواسر سنگرام	"
بندۂ خدا	۱۳۷

اوم تت ست

تمہید

عرصہ تقریباً پندرہ سال کا ہوا۔ جبکہ کسولی میں راقم نے گیتا کلاس کا اپنے مکان پر کچھ انتظام کیا تھا۔ چونکہ گیتا کی تعلیم اُس زمانے میں ارجن کو دی گئی تھی جبکہ بھارت ورش میں اعلےٰ علوم کا عام پرچار تھا۔ اس لئے بحالات موجودہ قدرتی طور پر ہر شخص کے لئے اس کا حقیقی مفہوم سمجھنا اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کہ سُننے والوں کی ذہنیت کم از کم اس حد تک علمی واقفیت سے موزون نہ ہو چکی ہو۔ جہاں تک کہ ارجن کی حالت تھی۔ اس لئے ہر ایک شلوک کی تشریح کرنے میں راقم کو اپنی واقفیت کے لحاظ سے بہت سی مشرقی اور مغربی علوم کی ایسی باتوں کو بھی سلسلۂ تقریر میں لانا پڑتا تھا۔ جن کا تعلق اس شلوک سے خیال میں آتا تھا۔ اس لئے نو آموز سامعین کے لئے جو کہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد مشکل سے گیتا پڑھنے کا ہی وقت نکال سکتے تھے۔ حافظے میں تمام باتوں کا قائم رکھنا بہت مشکل معلوم ہوا۔ لہذا اُن میں سے چند احباب نے جن میں بابو لبھو رام جی سونی اور ماسٹر جھبو رام جی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (جو کہ سناور سے رات کے وقت آمد و رفت کی تکلیف گوارا فرماتے تھے) اس امر پر زور دیا۔ کہ اگر ان مضامین کو خاص سلسلے میں بصورت کتب شائع کر دیا جائے تو پبلک اور شائقین کے لئے بدرجہا زیادہ مفید ہونے کا امکان ہوگا۔ اگرچہ قلیل الفرصتی اور کم علمی کی وجہ سے راقم کے لئے یہ کام نہایت مشکل تھا۔ تاہم بھگوان کے بھروسے پر یہ بارِ گراں اُٹھا ہی لیا۔ چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے

کے لئے تین کتابیں لکھنے کا خیال پیدا ہُوا۔ جن میں سے فلسفہ اعتدال چار حصوں میں اور فلسفہ اتحاد تین حصوں میں مکمّل ہو کر پہلی اور دوسری قسط کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ جن کی حیثیت گیتا کے طلبا کے لئے درحقیقت ویسی ہی ہے۔ جیسے تیرتھ یاترا کے واسطے چلنے سے پہلے مسافر لوگ ضروری اسباب باندھا کرتے ہیں۔ اب آتا ہے اصلی مضمون یعنی شریمد بھگوت گیتا کا تتو۔ یہ اِس فلسفہ نجات کی صورت میں بحیثیت تیسری قسط کے پیش کیا جاتا ہے

ع ۔ گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

اگرچہ یہ تو ایک ناممکن امر ہے۔ کہ عالم و جاہل ہر شخص کو راقم کے ان خیالات سے کلی اتفاق ہو۔ تاہم جیسا کہ اول الذکر ہر دو کتب کے ریویوز سے ظاہر ہوتا ہے۔ (جو کہ کتاب ہذا کے آخری صفحات پر مندرج ہیں) اس سلسلۂ تحریر کی نسبت نہ صرف گورنمنٹ عالیہ نے ہی مصنف کو انعام عطا فرما کر اظہار پسندیدگی کیا ہے بلکہ سناتن دھرمی احباب کے علاوہ آریہ سماج اور برہمو سماج وغیرہ دیگر فرقوں کے علم دوست اصحاب نے بھی نہایت قابل قدر اور تعریفی الفاظ میں شرف قبولیت بخشا ہے۔ ورنہ جہلا کی طرف سے تو کسی مضمون کی تعریف بھی داناؤں کی نگاہ میں کچھ معنے نہیں رکھتی۔ لبقول شاعر ؎

صائب دو چیز مے شکند قدر شعر را ۔ تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

بہر حال عیاں را چہ بیاں ؟ جن اصحاب کو کسی پہلو میں اختلاف رائے معلوم ہو وہ ہر سہ کتب کو شروع سے آخر تک مطالعہ کرنے کے بعد خیالات کی مطابقت کے اصول پر صداقت کا خود بخود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ورنہ مرض تعصب میں مبتلا اصحاب کو تو یرقان زدہ مریض کی طرح (جو کہ سفید شئے کو بھی زردہی محسوس کرتا ہے) سوائے اپنے خیالات کے اور کہیں بھی سچائی معلوم نہیں ہوتی۔ بمصداق

؎ نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر ۔ رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پہ جب نظر ۔ تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا ۔

چونکہ مکتی یا نجات کی نسبت نہ صرف راقم کا تصور ہی مروجہ عقائد مذہبی سے مختلف ہے بلکہ ایک طرف اگر وہ اصحاب جنہوں نے سائنس کے نقطۂ نگاہ سے رُوح کی اصلیت پر غور فرمایا ہے (جیساکہ فلسفہ اتحاد کے تیسرے حصے میں بالوضاحت انکشاف کیا جا چکا ہے) اس خیال کے علاوہ جو کہ کتاب ہذا میں ظاہر کیا گیا ہے کسی دوسری صورت کو معقول نہیں سمجھتے ۔ تو دوسری طرف بھگوت گیتا کے نقطۂ نگاہ سے بھی کوئی دوسرا تصور قرار دینا اس کے سدھانت کے برخلاف جانا ثابت ہوتا ہے ۔ اس لئے مشرقی اور مغربی تحقیقات کی مطابقت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہی خیال بلا تکلف پیش کر دیا گیا ہے ۔ جس سے نہ صرف اہل ہنود کو ہی اپنے بزرگوں کی تعلیم پر فخر کرنے کا موقع ہے ۔ بلکہ نوع انسان کی عملی زندگی یعنے کیریکٹر کو اعلےٰ ترین صورت دینے کے لحاظ سے بھی اس سے بہتر اور کوئی تعلیم نہیں کہی جا سکتی ۔ کیونکہ جس طرح بیرونی ہر قسم کی ترقی کیلئے آزادی کا ہونا ازبس ضروری امر ہے ۔ ورنہ چینی لڑکی کے پاؤں کی طرح قدرتی نشوونما نہیں ہو سکتی ۔ ویسے ہی سچے معنوں میں دھرماتما بننے کے لئے بھی ضروری ہے ۔ کہ انسان مکتی یافتہ ہو ۔ گویا مکتی یا نجات سے مراد کوئی موہوم روحانی کیفیت نہیں ۔ بلکہ فطرت انسانی کی تکمیل اور اخلاقی کمال کا یہ ایک لازمی سادھن ہے ۔ اسی کے حصول پر انسان عملی طور پر اپنے اندر برہم کی موجودگی کو تحقیق کر سکتا ہے ۔

امید ہے کہ ناظرین اس سلسلے کی تینوں کتابوں کا بغور مطالعہ فرما کر وہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے ۔ جس کو مدنظر رکھ کر مصنف نے اتنی محنت شاقہ

گوارا کی ہے کیونکہ اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔ کہ نجات اگر انسانی کوششوں کا آخری پھل ہے۔ تو اعتدال اور اتحاد بلحاظ فردی اور قومی تعلقات کے اسکے بہترین وسائل ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص سچے دل سے اس امر کا خواہشمند ہے۔ کہ اس کو حقیقی معنوں میں نجات حاصل ہو (خواہ بیرونی نقطۂ نگاہ سے وہ اسے سوراجیہ کا نام دے یا اندرونی نقطۂ نگاہ سے مکتی کے نام سے موسوم کرے) تو اس کے لئے لازمی ہے۔ کہ وہ پہلے اس کے مندرجہ بالا ہر دو سادھنوں سے پورے طور پر واقف اور عملی زندگی میں ان کا سچے دل سے عامل ہو۔ ورنہ جس طرح بغیر بنیاد کے کوئی مکان کھڑا نہیں ہو سکتا۔ یا بغیر علت کے معلول نہیں نظر آسکتا۔ ویسے ہی اس کی خواہش کسی صورت میں بھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی۔ چنانچہ اسی خیال کے زیر اثر کتاب ہذا کے لکھنے سے پیشتر ہم نے مندرجہ بالا نام کی دو کتابیں لکھنے کا اہتمام کیا۔ اور پرماتما کا شکر ہے۔ کہ اس نے ہماری محنت کو بہ خوش اسلوبی اختتام پر پہنچا کر برسوں سے شروع کئے ہوئے اس مہایگیہ کو نروگھن سماپت کیا۔ اور مصنف کو معہ ناظرین کے اس گیان امرت کا لطف اٹھانے اور اس سے مستفیض ہونے کا موقع دیا۔

(اوم شم)

بھگوت درشن

بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا	بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا
ہر کہ میل دید دارد در سخن بیند مرا	در سخن پنہاں شدم چوں بوئے گل در برگ گل

دیباچہ

بھگوت گیتا کے مطالعہ کی ضرورت

باوجود اس امر کو تسلیم کرنے کے کہ موجودہ مغربی تعلیم نے (جو کہ میکالے کے قائم کردہ اصولوں پر مبنی ہے) ہمارا حلقۂ نظر بہت وسیع کر دیا ہے اور علمی دُنیا کے بہت سے نئے دروازے سائنٹیفک تحقیقات کی صورت میں ہمارے سامنے کھول دیئے ہیں۔ نیز ہمارے عقلی قوائے کو کافی سے زیادہ طاقت بخشی ہے مگر اس دعوے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ کہ مذہبی عنصر کی عدم شمولیت کی وجہ سے یہ ایسے نتائج پیدا نہیں کر سکی۔ جن کو خالص مفید یا بے نقص کہہ سکیں۔ کیونکہ گو حکومت کا مذہب مختلف رکھنے اور تمام اہل ہند کے کسی خاص عقیدے کے پابند نہ ہونے کی وجہ سے مصلحت ملکی کا تقاضا یہی ہو۔ کہ محض مادی تعلیم پر زور دیا جائے۔ لیکن چونکہ تعلیم ایک معنوں میں روحانی غذا یا باطنی ورزش کا کام دیتی ہے اس لئے جس طرح جسمانی خوراک میں کسی خاص جزو غذا کی عدم موجودگی آخر کار مضر صحت ثابت ہوتی ہے یا کسی خاص عضو کی زیادہ ورزش بمقابلہ دیگر اعضا کے اس کو زیادہ مضبوط بنا کر دوسروں کی کمزوری کا موجب بنتی اور ہم آہنگانہ نشو و نمائے بدنی میں سدراہ ہوتی ہے۔ ویسے ہی صرف ذہنی قویٰ پر زیادہ زور دینے سے جہاں ایک طرف ہم لوگوں میں بحیثیت مجموعی ہر امر میں معقول پسندی اور نکتہ چینی کا ملکہ بہت ترقی پا گیا ہے۔ اور مذہبی مطابعت یعنے بزرگوں پر ستر دما کی طاقت کمزور ہو گئی ہے۔ وہاں دوسری طرف بمقابلہ خود اختیاری کے خود غرضی کا عنصر بڑھنے کی بدولت

ادائیگی فرائض کے خیال کی نسبت حصول حقوق کا جذبہ بھی حد اعتدال سے بڑھ کر بدمزگی کا موجب ہو رہا ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اہل یورپ کے لئے یہ طریقہ تعلیم از بس مفید ثابت ہوا ہے۔ لیکن جس طرح کسی ایک درخت کا پھول دوسرے پر پیوند کیا جانے سے مطلوبہ پھل نہیں پیدا کر سکتا۔ ویسے ہی اہل ہند کی زندگی پر (جو کہ خاص قسم کے مذہبی خیالات میں پرورش یافتہ ہے) مغربی خیالات کی قلم لگانا تسلی بخش نتائج نہیں پیدا کر سکا۔ لہذا نہ صرف اس کا نتیجہ شخصی طور پر ہی علمی و عملی بے آہنگی کی صورت میں نظر آنا لازمی ہوا ہے۔ بمصداق۔ ع

دل چاہے دلدار کو تن چاہے آرام ۔ دُبدھا میں دونو گئے مایا ملی نہ رام

بلکہ قومی ترقی کی گاڑی بھی دونو پہیوں کے برابر نہ ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ چنانچہ یہی خیال ہے۔ جو کہ ہر ایک ذکی الحس محب الوطن کے دل میں بار بار چٹکی لیتا اور اس کو اس امر کے لئے تحریک کرتا ہے۔ کہ کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرے۔ جس سے عوام کی علمی اور عملی زندگی میں مطابقت رونما ہو۔ اور ان کے ذہنی اور اخلاقی قوا کی نشوونما برابری کی صورت اختیار کرے۔ تاکہ بیرونی خیالات کی جو کہ خاص حالات کی بدولت زبردستی اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اندرونی زندگی سے ہم آہنگی ہو جائے۔ جس سے سچا اطمینان اور قومی ترقی نصیب ہو:۔

اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ کہ مختلف فرقوں کے عالم اپنی اپنی کتب مقدسہ کی تفسیر ایسے طریق پر کر رہے ہیں۔ کہ مشرق کا پرانا خیال مغرب کے نئے خیال سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اور گنگا جمنا کی طرح یہ دونو اس طرح پر مل جائیں کہ غیریت نابود ہو کر عقلی وحدت کا جلوہ نمودار ہو۔ چونکہ بنیادی صداقت

میں غیر مطابقت یا دوئی کی گنجائش ہی نہیں۔ اس لئے ان کی کوششوں کو بعید از امکان یا حصول لاحاصل کی خواہش سے تو منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ مگر بہ نظر تحقیق دیکھا جائے تو اس پہلو میں جو کام بھگوت گیتا کے مطالعہ سے نکل سکتا ہے۔ وہ کسی دوسری کتاب سے حاصل ہونا محال ہے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف یہ لاثانی نظم تمام شاستروں کا باہمی تعلق ظاہر کرنے والی۔ آسانی سے سمجھ آنے والی معقولات کی بنیاد پر قائم ہونے سے مقبول عام کا درجہ رکھنے والی یعنے مختلف عقاید کی تہ میں اتحاد کا رشتہ باندھنے اور تمام ہندو فرقوں کی نگاہ میں یکساں تقدس کا درجہ رکھنے والی گویا دھرم کا صحیح راستہ (صراط المستقیم) دکھانے والی ہے۔ وہاں دوسری طرف اس کا ظہور بھی باطنی کشمکش یعنے ذہنی پھوٹ کو ہی رفع کرنے کے لئے ہوا تھا۔ حالانکہ دیگر تمام کتب ان فوائد سے سراسر خالی ہیں۔ مصداق۔ ؎

واعظا نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو - کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

اس لئے مغربی تعلیم کے نقص کو رفع کرنے اور مکمل روحانی غذا بہم پہنچانے کے لئے اگر کوئی بہترین تجویز ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ شریمد بھگوت گیتا کے تتو کو عام فہم بنایا جاوے۔ اور ہر شخص اس کے پڑھنے کو پرم دھرم خیال کرے اسی سے بقول بھگوان کرشن قومی کشتی گرداب بلا سے نکل کر صحیح سلامت کنارے پر لگیگی۔ مصداق۔ ؎

ترک کر سب مذہبوں نے مجھ اکیلے کی پناہ - پھر مرا ذمہ ہے ارجن تیرا بیڑا پار ہے

گیتا کیا ہے؟ شریمد بھگوت گیتا کسی خاص کتاب کا نام نہیں بلکہ مہابھارت نامی مشہور کتاب کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس میں بھگوان کرشن کا وہ فلسفیانہ اُپدیش مندرج ہے۔ جو کہ انہوں نے کورکشیتر

کے میدان جنگ میں ارجن کو بحیثیت سارتھی کے اس وقت کہا تھا۔ جبکہ کورو پانڈو
کی دونو افواج کو ایک دوسرے کے بالمقابل لڑنے مرنے کیلئے تیار دیکھنے پر اس
کی طبیعت باطنی پھوٹ یعنے ذہنی بے آہنگی کی بدولت جوکہ بمصداق ؎
۱؎ دھرم سنیہہ ادبھے متی گھیری۔ بھئی گتی سانپ چھچھوندر کیری
کشاتر دھرم اور بندھو پریم کے خیالات کی ٹکر کا نتیجہ تھی۔ ایسی کمزور ہو گئی تھی۔
کہ وہ اپنے تئیں فرض منصبی کی ادائیگی کے ناقابل محسوس کرتا تھا جنگ سے
متنفر ہو کر بجائے ظالموں کو مار کر سوراجیہ حاصل کرنے کے خود مارا جانے یا
بھکاری کی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دینے لگ گیا تھا۔ اور خوفزدہ ہونے کے
آثار اس کے بیان سے عیاں ہو رہے تھے۔ بقول شاعر ؎

؎ دل شکستوں کا سخن ہووے نہ کیوں کر نادرست
ساز بگڑا ہو تو نکلے ہے صدا بگڑی ہوئی

گیتا کا مہتو
اگرچہ کہنے کو تو گیتا میں محض دھرم یدھ کی ہی تحریک کی گئی
ہے۔ لیکن درحقیقت جہاں ایک طرف اس میں زندگی

۱؎ یہ چوپائی رامائن میں ماتا کوشلیا جی کی زبان سے اس وقت نکلی تھی۔ جبکہ بھگوان
رام کو ان کے پتا جی کی طرف سے چودہ برس کے لئے بنوں میں جانے کا حکم ہو چکا تھا
اور وہ اپنی ماتا جی سے اجازت حاصل کرنے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے
تھے۔ چنانچہ ان کا مطلب یہ تھا۔ کہ ایک طرف مجھے اپنے پتی دیو اور راجا کی آگیا ماننا
دھرم ہے۔ اور دوسری طرف بیٹے کی محبت کا خیال ہے۔ ان دونو باتوں سے میری عقل
کا وہی حال ہے۔ جیسے سانپ کے منہ میں چھچھوندر آنے پر وہ کھالے تو کوڑھی اور چھوڑدے تو
کلنکی کہا جاتا ہے گویا "نہ راہ رفتن نہ روئے ماندن" والا معاملہ ہے۔ (دیکھو فلسفہ اتحاد حصہ اول صفحہ)

اور راحت یا صداقت اور دہرم وغیرہ ان تمام مسائلِ روحانی کا عقدہ کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ جن سے ہر فرد بشر کو دمبدم تعلق رہتا ہے۔ (اور اس طرح پر ٹوٹے ہوئے دل کی مرمت کے خیال سے "یوگ" کے نسخے پر خاص زور دیا گیا ہے) وہاں دوسری طرف ویدک لٹریچر کا عطر اور ہندو فلسفے کا نچوڑ بھی اس خوبی سے اس ہی جمع کیا گیا ہے۔ کہ بڑے بڑے عالم و فاضل اس کے مطالعہ سے حیرت میں آرہے ہیں۔ چنانچہ نہ صرف سوامی شنکر آچاریہ جی سے لے کر لوکمانیہ تلک تک سنسکرت کے وددان پنڈت یا فیضی سے لے کر حسن نظامی تک مسلمان صوفی ہی اس کی تفسیریں لکھنے یا ترجمہ کرنے میں دماغی قابلیت کے جوہر دکھا کر اس کی بھگتی کا ثبوت دے چکے ہیں۔ بلکہ ایمرسن اور کارلائل یا میکسمولر اور شوپنہاور جیسے اعلے درجے کے مغربی فلاسفر اور ڈاکٹر اینی بسنیٹ جیسے عالمگیر مذہب کے ماننے والے بھی اس کی تعلیم کو روحانی شانتی یا اطمینان قلبی کا ایک بہترین نسخہ قرار دیتے ہیں۔ اور عام اہلِ ہنود کی عقیدت کا تو کہنا ہی کیا ہے جو کہ اسم با مسمی سمجھتے ہوئے اسے الہام یزدانی (بھگوت گیتا) خیال کرتے ہیں۔ جس کے اظہار میں کسی رشی یا رسول وغیرہ کی وساطت کی گنجایش ہی نہیں ہوئی۔ بمصداق۔ ؎

کیوتر جانور ہے یار سے کیا جانیں؟ کیا کہدے؟
صبا کیسی۔ کہاں کا نامہ بر ہم آپ جاتے ہیں۔

حتےٰ کہ وید وغیرہ الہامی کتب اگر اپنے مصنف کے نام کی بدولت یعنے در ایشوری گیان،، کہلانے سے مقدس تسلیم کی جاتی ہیں۔ تو گیتا کی تقدیس کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف اس کا مصنف ہونے کی وجہ سے بھگوان کرشن کو ہی سولہ کلا سمپورن اوتار مانا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے نفس مضمون کو سلسلہ نظم میں ترتیب دینے

کی بدولت دیاس جی کو بھی چوبیس اوتاروں میں خاص درجہ دیا گیا ہے۔ اور راسخ الاعتقادی سے یہاں تک اس کی عظمت کے قائل ہیں۔ کہ نہ صرف روزانہ پاٹھ کرنا بلکہ مرتے وقت اس کا ایک آدھ شلوک سن لینا بھی باعث نجات خیال کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس کی عالمگیر مقبولیت صرف اسی سے ظاہر نہیں ہوتی۔ کہ لالہ لاجپت رائے و بھائی پرمانند جی وغیرہ اعلےٰ درجے کے محب الوطن اصحاب نے اپنے ایام جلاوطنی میں اس کے مطالعہ سے شانتی حاصل کی۔ اور اس کی نسبت پیام گیتا یا گیتا کے راز وغیرہ کی صورت میں اپنے خیالات قلمبند فرما کر اہل ہند کو اس مینار روشنی کی طرف توجہ دلائی۔ یا ان بنگالی نوجوان قوم پرستوں کے پاس جو کہ بم اور پستول وغیرہ کا استعمال کرنے کی وجہ سے گمراہ اور باغی کہلائے ایک ہاتھ میں آتشیں اسلحہ دستیاب ہوئے۔ تو دوسری بغل میں دل کے ساتھ گیتا کا گٹکا بندھا ہؤا پایا گیا۔ بلکہ مہذب دنیا میں کوئی ایسی زبان بھی نہیں جس میں اس کا ترجمہ نہ ہؤا ہو۔ حتےٰ کہ لحاظ کثرت اشاعت کے اگر کوئی کتاب بائیبل کا مقابلہ کرتی ہے تو وہ یہی گیتا ہے۔ نیز یہی گیتا ہے جس کی تعلیم سے قوراً اعلےٰ نور ہو کر سوامی وویکانند اور رام تیرتھ جیسے سنیاسیوں نے باوجود اہل ہند کی قومی زوال پذیر حالت کے امریکہ جیسی مہذب ترین قوم کے دل پر ہندو دہرم کی فضیلت کا ایسا سکہ جما دیا۔ کہ اہل دانش کی نگاہوں میں بمقابلہ دیگر دہرموں کے یہ پرم دہرم سمجھا جانے لگا۔

ماسوائے اس کے جس طرح گوسائیں تلسی داس جی نے رام سے اسکے نام کو افضل قرار دیا ہے۔ بمصداق۔ ؎

رام ایک تاپس تیا تاری - نام کوٹ کھل کومتی سدھاری

یعنی رام نے اہلیا نامی ایک تپسوی کی استری کو تارا۔ لیکن ان کے نام نے کروڑوں جاہل اور بدکاروں کا اُدھار کر دیا۔ ویسے ہی بغور دیکھا جاوے۔ تو ایک معنوں میں بذات خود بھگوان کرشن سے بھگوت گیتا کو افضل کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے تو صرف ارجن کو ہی گیان دیا۔ لیکن گیتا کی بدولت بیشمار اگیانیوں کو نور عرفان نصیب ہوا۔ یا یوں سمجھیں۔ کہ کرشن نے تو چند ایک اسروں کو جان سے مارا۔ مگر گیتا نے بیشمار اشخاص کے اسرپن کو دور کر کے انہیں زندہ جاوید کر دیا۔ لہذا کرشن اگر سولہ کلا سمپورن ہیں۔ تو گیتا اٹھارہ کلا سمپورن کہی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ اس کے ادھیاؤں کی تعداد سے ثابت ہے۔ سوال ہو سکتا ہے کہ گیتا کی اس عالمگیر اور لاثانی عظمت کا راز کیا ہے؟ جواب مختصراً یہی ہے۔ کہ یہ سناتن شاستر پرودھ کے صحیح استعمال کا اپدیش کرتی اور جہالت و کمزوری کو یکساں مہا پاپ قرار دے کر ان سے نجات حاصل کرنے کا سیدھا راستہ بتلاتی ہے۔ جس کو عملی زندگی میں نہ دھارن کرنے کی وجہ سے اہل ہنود دیا دھرم کے عامل ہوتے ہوئے بھی اپنی جان و آبرو کی حفاظت سے قاصر رہتے اور غنڈوں کو ظلم کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کی کمزوری ہی ان کی جرات کا باعث ہوتی ہے۔ بمصداق۔ ؎

کیوں بیٹھے اس ادا سے کہ پیار آگیا مجھے ۔ یہ آپ کا قصور ہے میری خطا نہیں

گیتا کی نسبت غلط فہمی

لیکن باوجود اس محبت اور عقیدت کے جو کہ عام طور پر اہل ہنود کو گیتا کے ساتھ ہے نہ صرف ادھمت کی نسبت اس کے خط کی عزت کرنے والوں کی طرح اکثر بھگت لوگ اس کے مہاتم کی کہانیاں پڑھنا ہی گیتا پاٹھ خیال کرتے ہیں۔ اور اس طرح پر اس کا مفہوم حقیقی سمجھ کر فائدہ اٹھانے سے محروم رہتے ہیں۔ بلکہ بذات خاص

گیتا کا مطالعہ کرنے والے بھی (علاوہ بغیر معنے جاننے کے پاٹھ کرنا کافی سمجھے گئے) مختلف یا متضاد رائیں رکھتے ہیں۔ گویا یہ کوئی علمی کتاب نہیں۔ بلکہ بھان متی کا پٹارہ ہے۔ جس میں ہر شخص کو اپنی اپنی مطلوبہ صورت نظر آتی ہے۔ جیسا کہ مختلف فرقوں (سمپرداؤں) کے بھاشیہ اور ٹیکا یا ترجمے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے۔ بقول شاعر۔ ؎

سمجھ لیتے ہیں اپنے مدعا کی سننے والے سب۔
کہ آتش کی غزل میں لطف ہے مجذوب کی بڑ کا۔

جتنے اکہ کثرت اختلاف کو دیکھ کر باون بھاشیہ اور بیشمار ترجمے ہونے کے باوجود یہی مشہور مقولہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ "مانا جانے سو پتا۔ اور کرشن جانے سو گیتا"۔ یعنے جس طرح کسی کے باپ کی نسبت اس کی ماں ہی صحیح علم رکھتی ہے۔ کوئی دوسرا شخص یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ ویسے ہی گیتا کا اصل مفہوم بھی بھگوان کرشن ہی جانتے ہیں۔ ورنہ ایسی گنجینہ ہدایت اور مشعل طریقت یا رہنمائے معرفت کی موجودگی میں جس پر بلحاظ تمام قوم کی نگاہیں مرکوز ہو رہی ہوں۔ اور بوقت نزع بھی اس کا سننا مکتی دینے والا خیال کیا جاتا ہو۔ اہل ہند ایسی تفرقہ انگیز اور ذلیل حالت میں نہ ہوتے۔ جس کی بدولت "پھوٹ"، ہندوستان کا مشہور میوہ کہا جاتا ہے ؎

رشتۂ وحدت میں جب انکو پرو سکتا ہے تو
پھر یہ بکھرے کیوں تری تسبیح کے دانے رہے؟

کتنی حیرت کی بات ہے کہ باوجود اس امر کو دیکھنے کے کہ گیتا میں ارجن کو ان تین اصولوں کی بنا پر (۱) جس طرح ہر ایک شئے کسی نہ کسی کام میں آنے کے لئے ہے۔ ویسے ہی ہر فرد بشر فطرتی اوصاف (گن کرم) کی بدولت کسی

نہ کسی کام کرنے کے لئے ہے۔ (۲) کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی بیکار نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ زندگی درحقیقت کرم (حرکت) کا ہی نام ہے (۳) شخصی یا قومی مفاد اور ضروریات کے خیال سے کسی آدمی کو اپنے منصبی فرائض کی ادائیگی سے غافل رہنا بھی نہیں چاہئیے) ایسا کرم کرنے کی تحریک کرنے کے ساتھ ہی وہ لاثانی طریقہ بتایا گیا ہے۔ جس سے جنم بندھ کا علاج کرتے ہوئے کرم بندھ سے محفوظ رہے۔ گویا فرض کو فرض کی خاطر پیار کرنا سکھلایا گیا ہے۔ اور اس تعلیم کے نتیجے کے لحاظ سے نہ صرف اس نے الفاظ کی صورت میں ہی تعمیل ارشاد کے لئے سر تسلیم خم کیا۔ بلکہ واقعی بھی ایسا کام کیا۔ کہ آج تک اس کے قصے مشہور ہیں۔ بایں ہمہ "مرغی کی ایک ٹانگ" کی بڑ ہانکنے والوں کی طرح کثیر التعداد ایسے گیتا پاٹھی پائے جاتے ہیں۔ جو کہ گیتا کو ایسا برہم گیان کا گرنتھ سمجھتے ہیں۔ جس میں فرائض منصبی چھوڑ کر عالم تصور میں ہی وقت گزارنے کی تعلیم دی گئی ہے ع۔ "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"۔ جس کی بدولت یہ ایک زبان زد عام محاورہ ہو رہا ہے۔ "جس نے پڑھی گیتا۔ اس نے گھر کب کیتا؟" یعنی جس نے گیتا کا مطالعہ کر لیا۔ اس نے خانہ داری کے فرائض کب ادا کئے۔؟ چنانچہ اسی غلط فہمی کی اصلاح کے خیال سے جہاں ایک طرف ہم نے اپنی تصنیف فلسفہ اعتدال کے دیباچے میں خاص توجہ دلائی ہے وہاں دوسری طرف علاوہ دیگر عالم اصحاب کے لوکمانیہ تلک جی کا گیتا رہسیہ بھی قابل دید ہے۔ جسمیں انہوں نے بالوضاحت ظاہر فرمایا ہے۔ کہ اس تعلیم کی اصلی غرض صرف ارجن کو جنگ کے لئے تیار کرنا تھی۔ نہ کہ کسی قسم کی فلسفیانہ باریکیاں چھانٹنا یا دنیاوی کاروبار

پھانسنا یا دنیاوی کاروبار سے تھکے ہوئے بوڑھوں یا تارک الدنیا اصحاب کے لئے دل بہلاوے کا سامان مہیا کرنا۔ اس لئے اصلی معنوں میں گیتا کا ادھکاری وہی کہا جا سکتا ہے۔ جو کہ اپنی عقل سے کام لینے اور اس کے بموجب عمل کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

ایسے ہی راج دہرم لینے بدھ کی تعلیم دیکھنے کے باوجود بعض کوتاہ اندیش اصحاب پاتنجل یوگ سمادہی میں محو رہنا یا تپسیا پنی وغیرہ کی صورت میں کرشن بھگتی کرتے ہوئے عمر گذارنا گیتا کی تعلیم کا ماحصل خیال کرتے ہیں۔ غرضیکہ ایک طرف اگر گیان (یوگ) کی جگہ اجزا ذکر۔ بھگتی یا گیان کو فوقیت دی جاتی ہے تو دوسری طرف اکثر صورتوں میں اس کے بنیادی اصول سے ہی اس کی تعلیم اُلٹی خیال کی جاتی ہے۔ جیسے کہ دہرم کرم یوگ یگیہ ابھیاس ویراگ تپ تیاگ وغیرہ بہت سے اصطلاحی الفاظ کا مفہوم غلط سمجھنے کی طرح پرم گتی یا مکتی کے معنے بھی ایسے خلاف حقیقت سمجھ لئے گئے ہیں۔ کہ بیشمار افراد "شریہ مارگ" (راہ راست) کو چھوڑ کر اِدہر اُدہر کی پگڈنڈیوں یا جھاڑیوں میں اُلجھے ہوئے جہلا یا پاگلوں کی پوجا میں خستہ خوار ہو رہے ہیں۔ دریں حالات اگر نتیجہ خلاف خاطر پیش آئے تو تعجب ہی کیا ہے؟ ؎

اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے
پڑیں پتھر سمجھ ایسی پہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے

طریقہ علاج

بہرحال ایسی غلط فہمیوں کے عالمگیر ہونے کے خیال نے مجبور کیا۔ کہ موجودہ حالات کی مطابقت کے لحاظ سے یعنی سائینس کی روشنی میں گیتا کی حقیقت کا اظہار کیا جائے۔

اسمیں شک نہیں۔ کہ گیتا بذات خود محض اونپشدوں کا ہی نہیں۔ بلکہ
حقیقی معنوں میں تمام ویدشاستروں کا تتو ہے اور وہ بھی بھگوان
کرشن جیسی سروگیہ ہستی یعنی عالم کل کا نکالا ہوا۔ اور وید ویاس جیسی
عقل مجسم شخصیت کا ترتیب دیا ہوا۔ اس لئے کمترین مصنف جیسے
الپگیہ یعنی ہیچمدان شخص کا ایسے تتو کے تتو نکالنے کا دعوے کرنا
"چھوٹا منہ بڑی بات" کا ہی مصداق بنتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ
جہاں ایک طرف مختلف محققین کا یہ فیصلہ عام طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے
کہ بھگوت گیتا اپنی موجودہ صورت میں درحقیقت وہ گیتا نہیں۔ جو کہ
شری کرشن کی زبان مبارک سے نکلی تھی۔ گویا یہ اٹھارہ ادھیائی گیتا
مول گیتا پر بعد کی اضافہ شدہ حالت کا نتیجہ ہے۔ (جیسا کہ شنکر بھاشیہ
کے بالمقابل دیگر کتابوں میں تیرھویں ادھیائے کا پہلا شلوک زاید پایا
جاتا ہے) وہاں دوسری طرف بہت سے ودوان یہ رائے بھی ظاہر کر چکے
ہیں۔ کہ اگر صرف دوسرے ادھیائے کو بھی سمجھ کر پڑھ لیا جاوے تو
پوری گیتا کے پاٹھ کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف
تیسرے ادھیائے سے ارجن کا شنکا سمادھان کا سلسلہ شروع
ہونے سے یہ یقین ہوتا ہے۔ کہ بھگوان اپنا اصلی لیکچر دوسرے ادھیائے
میں ہی ختم کر چکے ہیں۔ وہاں دوسری طرف چوتھے ادھیائے کے آغاز
میں بھگوان کرشن نے خود زبان مبارک سے بھی ارجن کو فرمایا ہے
کہ یہی "یوگ"، کی تعلیم میں نے ابتدائے عالم میں سورج وغیرہ راج
رشیوں کو دی تھی۔ جس کے فراموش ہونے پر اب مجھے دوبارہ یاد دہانی
کے طور پر تمہیں اپدیش کرنا پڑا ہے۔ گویا اپنی اصلی تعلیم وہ دوسرے

ادھیائے میں ہی مکمل کر چکے تھے۔ (چنانچہ اسی خیال سے گذشتہ سال
گیتا جینتی کے جلسے پر شدھ سبھا کی طرف سے دوسرے ادھیائے کی
ہی بہت سی کاپیاں عوام میں تقسیم کی گئی تھیں) علاوہ ازیں ایک شخص
اگر سات سو شلوک کی جگہ ستر شلوک کی گیتا کو مول گیتا قرار دیتا ہے۔
(جو کہ جاوا میں دستیاب ہوئی ہے) تو بعض اصحاب سات شلوک کا
ہی پاٹھ کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک مولف بجائے اٹھارہ
ادھیائے کے تیرہ ادھیائے کو ہی اصلی گیتا بیان کرتا ہے۔ مطلب
بہر حال یہ ہے۔ کہ عام طور پر بحالات موجودہ اٹھارہ ادھیائی گیتا کا مطالعہ
ضرورت سے زیادہ خیال کیا جاتا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اس
کی کاٹ چھانٹ ضروری سمجھی جاتی ہے ٭

دیگر۔ تقریباً تیس سال سے لگاتار گیتا کے مطالعہ میں دلچسپی
رکھنے اور بیسیوں ٹیکا یا ترجمے پڑھنے سے راقم پر یہ بھی روشن ہو
چکا ہے۔ کہ جہاں ایک طرف عام ترجموں میں چند خاص شلوکوں
کے شبدوں پر کھینچ تان کر کے اپنا سدھانت پیش کرنے کے علاوہ
چنداں معنوی فرق نہیں پایا جاتا۔ وہاں دوسری طرف پوری کتاب کا
ترجمہ کئے جانے پر وہ نکات اس وقت تک جگیاسو کی نگاہ کے
سامنے واضح طور پر نہیں آ سکتے۔ جب تک کہ مفصل تشریح نہ کی
جائے۔ اور مفصل تفسیروں کی نہ صرف پیشتر ہی کافی سے زیادہ
بھرمار ہو رہی ہے۔ بلکہ اگر نئی تشریح یا توضیح لکھی بھی جائے
تو آج کل کی غیر معمولی مصروفیت اور روٹی کے سوال کی پیچیدگی
کی وجہ سے عام پبلک کے لئے اس کے پڑھنے کا وقت نکالنا

بھی محال معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں نہ صرف دُنیا کی حقیقت روح کی ماہیت
اور خدا کی اصلیت کے مضامین پر فلسفہ اتحاد میں بالتفصیل بحث کی جا
چکی ہے بلکہ سائنس کی ترقی کی بدولت گیتا میں بیان کردہ کمشتر اکشتر و دیا
(کاسمالوجی) اور کشیتر گیہ گیان (بایالوجی و سائیکالوجی) کے طرزِ بیان اور
نفسِ مضمون کی نسبت مغربی طریق پر تعلیم یافتہ اصحاب کی طرف سے خاص پہلو
میں معترض ہونا بھی ممکن ہے۔ نیز درحقیقت یہ مضامین گیتا کے خاص اپنے
بھی نہیں۔ بلکہ دوسرے ادھیائے میں بیان کئے ہوئے سدھانتوں کی تشریح
کے ساتھ سلسلہ میں ہی آ گئے ہیں۔ اس لئے تمام پہلوؤں کا خیال کرتے
ہوئے یہی بہتر معلوم ہوا۔ کہ بجائے پوری گیتا کی تشریح کے اس کا تتو ہی شائقین
حق کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ تاکہ جہاں ایک طرف خاص قسم کا
نرالا پن پیدا ہو کر مذاق سلیم کے لئے پرلطف ثابت ہو۔ وہاں دوسری
طرف وہ مفہوم بھی چشم باطن کے سامنے نمایاں صورت میں آ جاوے
جس کی بدولت بالعموم گیتا کو پرم دہرم شاستر یا موکش درشن (فلسفہ نجات)
کہا جاتا ہے +

شریمد بھگوت گیتا کا تتو

المعروف

فلسفہ نجات

اگرچہ فلسفہ نجات یعنی موکش درشن ہونے کی وجہ سے تو یہی موزون کیا جا سکتا تھا کہ گیتا کا تتو، لکھنے کی صورت میں مکتی کی حقیقت اور اس کے سادھنوں کا ہی ذکر کر دیا جاتا۔ لیکن چونکہ کتاب ہذا کی تصنیف میں گیتا کی اصلی تعلیم کا انکشاف بھی مدِ نظر ہے۔ جس میں سرشت انسانی کے چاروں عناصر (جسم و نفس اور عقل و اخلاق) کی تکمیل کی غرض سے جزوی اور کلی ہر دو نقطہ نگاہ سے بالترتیب سانکھیہ اور یوگ کی صورت میں پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ پہلے ہی ظاہر کیا جا چکا ہے کہ اسکی مکمل کیفیت دوسرے ادھیائے کے اندر کوزے میں سمندر کی طرح بند پائی جاتی ہے۔ اس لئے بہتر یہی سمجھا گیا ہے کہ پہلے حصے میں شریمد بھگوت گیتا کے دوسرے ادھیائے کا ترجمہ معہ تشریح کے نذر ناظرین کیا جاوے اور دوسرے حصے میں ان مسائل پر (جو کہ گیتا میں بحیثیت مجموعی بیان کی گئی ہیں) بحث کرتے ہوئے آخیر میں مکتی کا سروپ دکھلا کر مضمون کو ختم کر دیا جاوے۔ تا کہ جہاں ایکطرف وہ تمام بنیادی اصول سمجھ میں آجاویں۔ جو کہ گیتا میں بتلائے گئے ہیں۔ وہاں دوسری طرف وہ تمام غلط فہمیاں بھی رفع ہو جاویں۔ جو کہ گیتا کے اصطلاحی الفاظ کے متعلق عام لوگوں میں پائی جاتی ہیں:

حصّہ اوّل

ابتدائی باتیں

مہاراجہ یدھشٹر کے تیرہ برس بنباس کی شرط پوری کرنے کے بعد جب شری کرشن سفیر صلح بن کر درپودھن کے پاس گئے۔ اور وہ پانچ گاؤں کی صورت میں بھی ان کا حصّہ سلطنت دینے پر رضامند نہ ہوا۔ تو آخر فیصلہ تلوار کے سپرد کرنا پڑا۔ چنانچہ جب دونو طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہو گئیں۔ اور نقارۂ جنگ بج گیا۔ تو ارجن نے میدان میں آ کر کیا دیکھا۔ کہ دونو طرف خویش و اقارب ہی سر بکف ہو کر کھڑے ہیں۔ اس درد انگیز نظارے کی تاب نہ لا کر اس کا دل بیقرار ہو گیا اور اس نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ کہ ہے کرشن! ان اپنے عزیز و اقربا کو لڑنے مرنے کے لئے تیار دیکھ کر میرے اعضا ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اور میرا منہ خشک ہو گیا ہے۔ میرا بدن کانپتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں میرا کمان ہاتھ سے گرا جا رہا ہے اور جلد میں آگ سی لگ رہی ہے۔ مجھے کھڑا ہونا دوبھر ہو رہا ہے۔ اور میرا سر چکر کھا رہا ہے۔ مجھے شگون بد نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے میں لڑائی میں بہتری نہیں سمجھتا۔ کیونکہ جن کے لئے ہم راج بھوگ۔ اور سکھ کی خواہش کرتے ہیں۔ وہی جان و مال کا خیال چھوڑ کر جنگ کے لئے تیار ہیں۔ اس لئے ہمیں فتح پاتے یا سلطنت اور راحتوں کے حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔ کیونکہ ان عزیزوں کے مارنے کے بعد ہمیں کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اگر ہم ان کو اپنے جانی دشمن سمجھ کر انتقام کے خیال سے بھی ہلاک کریں گے۔ تا ہم ہمیں پاپ ہی لگیگا۔ نیز اگرچہ

طمع نفسانی کے جوش میں اندھے ہونے سے ان کو یگانوں کے ہلاک کرنے میں کوئی بُرائی نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم جان بوجھ کر کس طرح قوم اور خاندان کو تباہ کر سکتے ہیں؟ کیونکہ خاندان کے تباہ ہونے سے کُل دہرم نہیں رہ سکتا اور ادہرم کے غلبہ پانے پرورن سنکر اولاد کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اور یہ ہم نے سُنا ہے۔ کہ ایسی اولاد اپنے لواحقین اور بزرگوں کو دائمی دوزخ میں ہی گرانے کا موجب ہوتی ہے۔ اس لئے میں تو ان رشتہ داروں کا مارنا سخت گناہ خیال کرتا ہوں حتےٰ کہ اگر یہ مجھے مار بھی ڈالیں۔ تو بھی مقابلے میں ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔ یہ کہہ کر اس نے تیر کمان ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اور افسوس کی حالت میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔

ارجن کے اعتراضات

گویا بحیثیت مجموعی خاص جذبے کے زیر اثر ارجن نے نہ لڑنے کے لئے تین دلائل پیش کیں۔ اول یہ کہ ان عزیزوں کو مار کر ہم سلطنت کا پورا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ کیونکہ خودغرض شخص کے لئے بھی مکمل راحت تبھی ہو سکتی ہے۔ جبکہ دوسرے سمبندھی اس کے ساتھ شریک ہوں۔ دوم۔ یہ کہ گو دریودھن وغیرہ ہماری جان اور عزت کے دشمن ہیں۔ تاہم ان کو قتل کرنے سے ہمیں پاپ ہی ہوگا جس کا نتیجہ مصیبت کی صورت میں پیش آنا لازمی ہے۔ سوم یہ کہ قومی تباہی اور دہرم کا ناش ہوگا۔ جس سے ہمیں اور ہمارے بزرگوں کو دائمی دوزخ نصیب ہوگا۔

اگرچہ ان میں قومی تباہی کا بھی احتمال جتایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ان ہر دلائل کی تہ میں ارجن کا اپنے سکھ حاصل کرنے کا خیال اور دکھ یا نرک سے بچنے کی خواہش نمایاں حثیت رکھتی ہے۔ حالانکہ یہی دو امور

اخلاقی نقطۂ نگاہ سے معیوب اور فرض کو فرض کی خاطر ادا کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ اس لئے بھگوان نے فوراً یہ تاڑ لیا۔ کہ جس طرح کوئی نادان بچہ کڑوی دوائی پلانے پر اس سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی کڑواہٹ کو تو محسوس کرتا ہے۔ مگر اس کے صحت بخش یعنی مفید اثر سے ناواقف ہوتا ہے۔ ویسے ہی ارجن یدھ کے ظاہری نقائص کو تو دیکھتا ہے۔ لیکن اس کے حقیقی فوائد کو نہیں سمجھتا۔ جو کہ انصاف اور راستبازی کی حکومت کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ یہ امر اس کے ذہن نشین کرایا جاوے۔ کہ کسی کام کا اچھا یا بُرا ہونا محض اس کے فوری نتائج پر ہی انحصار نہیں رکھتا۔ بلکہ فاعل کی نیت اور دور اندیشی پر مبنی ہوتا ہے۔ ورنہ کسی مجرم کو سزا دیا جانا ہرگز حق بجانب نہ کہا جاتا۔ جو اصول کہ عالمگیر طور پر مجلسی زندگی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ بقولیکہ ؎

نکوئی با بداں کردن چناں است ۔ کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

بھگوان کا جواب

لیکن بندۂ جذبات دیکھ کر عقل کو اپیل کرنے سے پہلے اس کے جذباتِ اعلیٰ کو ہی تحریک کرنا بہتر خیال کیا۔ اور فرمایا۔ کہ ہے ارجن! اس نازک وقت اور کڑے امتحان کے موقع پر یہ کائرپن تجھ میں کہاں سے آگیا؟ جو کہ رذیل آدمیوں کا خاصہ ہے۔ نیز سورگ کے حصول میں رکاوٹ ڈالنے اور دُنیا میں بدنام کرنے والا ہے۔ نامردوں کی روش کو مت اختیار کر۔ یہ تمہارے لئے موزوں نہیں۔ اس بزدلی کو چھوڑ اور اُٹھ کھڑا ہو۔

ارجن کا اعتراض

یہ سنکر ارجن نے جواب دیا۔ کہ بھگوان! بھیشم پتاما اور درونا چاریہ جیسے قابل پرستش بزرگوں

کو دشمنوں یا راکشسوں کی طرح کیسے تیروں کا نشانہ بناؤں؟ خواہ یہ
زر پرست ہوں یا حکومت پرست۔ تاہم ان کو قتل کر کے خون آلودہ راحتیں
حاصل کرنے کی نسبت تو بھیک مانگ کر گزارہ کر لینا اچھا ہے۔ علاوہ ازیں
ہم یہ بھی نہیں جانتے۔ کہ ہم میں سے فتح حاصل کرنا کس کے لئے بہتر ہوگا؟
جن کو مار کر ہم زندگی سے بیزار ہونگے۔ وہی رشتہ دار ہمارے سامنے
کھڑے ہیں۔ ان حالات میں میری تو عقل ماری گئی ہے۔ آپ جو مفید
راستہ خیال فرماویں۔ مہربانی کر کے مجھے اسی پر چلنے کی تلقین کریں اور
اس اخلاقی شش و پنج کی دلدل سے نکالیں۔ ورنہ اس باطنی کشمکش
سے میری طبیعت تو ایسی بگڑ رہی ہے۔ کہ اس دنیا کا تو ذکر ہی کیا؟ اگر
سورگ کا بھی راج مل جائے۔ تاہم یہ بیقراری دور ہوتی نظر نہیں آتی۔
لہذا میں تو نہیں لڑوں گا۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

مطلب یہ کہ پہلے تو احباب و اقربا کی محبت اور ہمدردی کی وجہ سے ارجن
کے دل میں رحم و افسوس اور رنج و غم کے جذبات نمودار ہوئے۔ جن کو
بھگوان نے نامناسب اور احمقانہ قرار دیا۔ اور اس کی تسلی کے لئے
فرض انسانی کا مسئلہ زیر بحث لائے۔ جو کہ آدمی کی اس قابلیت اور
طاقت پر انحصار رکھتا ہے۔ جو کہ وہ مجلسی خدمت کرنے میں کام لا سکے
لیکن پیشتر اس کے کہ بقائے روح اور توحید حق کے خیال کو پیش
کرتے۔ جو کہ فرائض انسانی کی حقیقی بنیاد کہا جا سکتا ہے انہوں نے اس
کے جذبات اعلیٰ یعنی شجاعت و بہادری یا اولوالعزمی و کشتری پن
اور نیکی و نیکنامی وغیرہ کو تحریک دی۔ اس کے جواب میں ارجن نے بھی
ویسے ہی اعلیٰ جذبے کو چوتھی دلیل کی صورت میں پیش کیا۔ کہ قابل پرستش

بزرگوں کو مارنے کی بدنامی ہوگی۔ گویا اگر جنگ میں قتل عام روا بھی
رکھا جائے۔ تو قتل خاص تو جائز نہیں ہو سکتا۔ یعنے جن کی عزت کرنا
فرض ہے۔ ان کو کیسے ماریں؟ بہرحال اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ کسی طرح
اس ناخوشگوار فرض سے چھوٹ جاؤں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شری کرشن
کے سامنے سر تسلیم خم بھی کر دیا۔ اور فرض کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان
کا شاگرد بننا بھی قبول کر لیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے دل پر
ان کے کلام کا خاص اثر ہو بھی گیا تھا۔ اور وہ اپنی غلطی یا کمزوری کو مان
گیا تھا۔ جو کہ اس نے دھارمک دُبدھا کے خیال سے پیدا شدہ ذہنی
دھندلاپن سے منسوب کی۔ نیز یہ کہہ کر کہ "میں نہیں لڑوں گا" اس
نے اپنے عقیدے کی پختگی اور اس خیال کو معقول سمجھنے کا بھی اظہار
کر دیا۔ گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ میں فرض کی ادائیگی سے کوتاہی
نہیں کرتا۔ بلکہ یہ سمجھنے سے ہی معذور ہوں۔ کہ بحالات موجودہ میرا فرض
کیا ہے؟ اس لئے آپ کا شاگرد بن کر دھرم کا راستہ پوچھتا ہوں
جس طرح آپ ارشاد فرمائیں گے۔ ویسا کروں گا؛ چونکہ گورو بھگتی کا
تقاضا یہ ہوتا ہے۔ کہ شاگرد اپنے تئیں مٹی کی طرح ان کے حوالے کر دے
وہ جیسا بہترین خیال کریں۔ ویسا اس سے برتن بنائیں۔ اس لئے ضروری
ہے۔ کہ وہ مخالفانہ طور پر ان کی تقریر پر نکتہ چینی نہ کرے۔ بلکہ سمجھنے کا
شائق ہو۔ ورنہ وہ تعلیم اثر نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سے یہ بھی مراد نہیں
کہ وہ اپنی قوت فیصلہ یا دلیل کو معطل ہی کر دے۔ بلکہ گورو کے لئے شردھا
اور عزت رکھتے ہوئے روشنی حاصل کرے۔ چنانچہ یہی طریق عمل ارجن
نے اختیار کیا۔ جہاں کسی قسم کی شنک پیدا ہوئی۔ اس کے جواب حاصل

کرنے کا تقاضا کیا۔ اور سری کرشن جی نے بھی شانتی سے تمام باتیں سمجھائیں اور اخیر میں پھر اس سے کہا۔ کہ میں نے یہ مخفی ترین راز تم پر ظاہر کر دیئے ہیں۔ اب ان پر غور کر کے جیسا چاہو۔ ویسا کرو۔ اس طریق عمل سے گورو چیلے کے باہمی سلوک کا بھی سبق ملتا ہے۔ گویا یہ انسان کی اپنی ذمہ واری ہے۔ کہ وہ سچائی کو سمجھے اور اس کی روشنی میں جو نیک راستہ نظر آئے اُس کو اختیار کرے۔

بھگوان کا اُپدیش

چونکہ پہلے ارجن نے شاگرد بن کر بھگوان سے ہدایت حاصل کرنے کی درخواست کی۔ اور پھر یہ کہا۔ کہ میں نہیں لڑوں گا۔ اس لئے اس کی تقریر میں ایک قسم کا اجتماع ضدین کا نقشہ بن گیا۔ جس کی بدولت اس کا اضطراب قلبی بخوبی نمایاں ہو گیا چنانچہ ایک طرف تو ایسی مضحکہ خیز حالت کو دیکھ کر۔ اور دوسری طرف بدیں خیال کہ اعلےٰ درجے کے اُستاد میں خوش طبعی کا وصف ہونا۔ ازبس ضروری ہے۔ سری کرشن بھگوان نے مسکراہٹ کی سی حالت میں سلسلۂ تقریر یوں شروع کیا۔ ع۵

زندگی اور موت کی حقیقت

(۱۱) تم باتیں تو منطقی اصحاب کی طرح کرتے ہو۔ لیکن رنجیدہ ان کے لئے ہو رہے

ع۵ درحقیقت یہاں سے گیتا کا لیکچر شروع ہوتا ہے۔ اور دوسرے ادھیائے کے گیارھویں شلوک سے لیکر شلوک نمبر ۵۳ تک پورا ہو جاتا ہے اسکے بعد ارجن کے سوال شروع ہو جاتے ہیں۔ جن کا جواب دیتے ہوئے اٹھارہویں ادھیائے تک اسی مضمون کو مختلف طرح پر ذہن نشین کرانے کی کوشش کیگئی ہے۔

ہو۔ جن کے لئے رنج نہیں کرنا چاہئیے۔ اصلی عقلمند اصحاب زندہ رہنے یا مرنے کا افسوس نہیں کیا کرتے ۔

(۱۲) میں تم اور یہ راجے کبھی نابود نہیں تھے۔ اور یقیناً آئیندہ بھی ہم سب معدوم نہیں ہونگے۔ (زمانہ حال کی نیستی کا تو ذکر ہی کیا؟)

چونکہ جسمانی صورت کا فنا ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس لئے بقائے انسانی تبھی ممکن ہے۔ جبکہ وہ جسم سے علیحدہ ہو۔ چنانچہ اس مطلب کا اظہار کرنے کے لئے یہ فرماتے ہیں۔

(۱۳) جس طرح انسان کو اس جسم میں بچپن جوانی اور بڑھاپے کی حالتوں میں سے گزرنا پڑتا ہے ویسے ہی دوسری صورت نصیب ہوتی ہے اہل عقل یا صاحب استقلال اس تبدیلی سے گھبرایا نہیں کرتے ۔

مغربی فلاسفر ڈے کارٹے نے جس طرح سائیکولاجیکل نقطۂ نگاہ سے اپنے شک کرنے کے عمل کی بنا پر ہی اپنی ہستی کو شک سے بالاتر تسلیم کیا۔ ویسے ہی بھگوان کرشن نے بایولاجیکل نقطۂ خیال سے روح کے دوام کا ثبوت پیش کیا ہے کیونکہ ہر شخص بچپن جوانی وغیرہ کی جسمانی نفسانی عقلی اور اخلاقی تبدیلیوں کو دیکھنے کے باوجود اس امر کو بلا شبہ تسلیم کرتا ہے۔ کہ میں بڑھاپے میں وہی ہوں جو کہ بچپن میں ادہر اُدہر کھیلا کرتا تھا۔ حالانکہ جسمانی صورت تو در کنار عادات جذبات خیالات اور خواہشات وغیرہ ہر شے میں تغیر ہو چکا ہے ۔ لیکن جہاں ڈے کارٹے کے خیال روح پر سائنٹیفک پہلو سے سخت اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جسم کی طرح قوت آگاہی بھی ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتی۔ وہاں بھگوان کرشن کا تصور روح ناقابل تردید

دلائل کی بنا پر قائم نظر آتا ہے۔ کیونکہ بچپن اور جوانی وغیرہ کے الفاظ صرف جسمانی تغیرات پر ہی دلالت نہیں کرتے۔ بلکہ قوت آگاہی کی تبدیلیوں کے بھی ویسے ہی مظہر ہیں چنانچہ بحالت جنین یا بچپن کی ابتدائی حالت میں اگر قوت آگاہی نمودار ہی نہیں ہوتی (یا ہوتی ہے۔ تو بہت ہی نامکمل درجے کی) تو بحالت جوانی تمام قوائے ذہنی انتہائی درجے کے کمال پر پہنچ جاتی ہیں اور بڑھاپے میں پھر ان میں کسی قدر کمزوری رونما ہو جاتی ہے۔ گویا جس طرح گہری نیند۔ خواب اور بیداری کی حالتوں میں قوت آگاہی کے تغیرات نمایاں ہوتے ہیں۔ ویسے ہی بچپن جوانی اور بڑھاپے میں بھی جسمانی تبدیلیوں کی طرح قوت آگاہی میں تبدیلی ہونا اظہر من الشمس ہے۔ اب جس طرح جسمانی تبدیلیوں میں قوت آگاہی کا یکساں موجود رہنا ذات روح کے لاتغیر یا باقی رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ ویسے ہی قوتِ آگاہی کے تغیرات اس کی تہ میں ایک ایسی حقیقی ہستی کی موجودگی پر دلالت کرتے ہیں۔ جو کہ ادراک کی حدود سے بالاتر ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس طرح ایک ہی برقی قوت روشنی گرمی یا حرکت وغیرہ کی صورتوں میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک ہی ذات حق قوت آگاہی کی مختلف حالتوں میں جلوہ آرا نظر آتی ہے۔ نیز جس طرح کسی ایک کمپنی یا کارخانے کے ٹوٹ جانے پر اس میں کام کرنے والے اشخاص کسی دوسری جگہ باہم مل کر یا علیحدہ ہو کر کام کرتے ہیں۔ ویسے ہی انسان جو کہ بیشمار سیلز کا مجموعہ ہے۔ یا اس کا ہر ایک سیل بیشمار ذرات کے ملنے سے بنتا ہے۔ وہ بھی نہ صرف موجودہ جسم میں ہی متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ اس کے بعد بھی اپنی ہستی قائم رکھتے ہیں۔ لہذا اس میں افسوس کی جگہ ہی کیا ہے؟ جیسے لیمپ کا تیل جل جانے پر ہوا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ معدوم نہیں ہو جاتا۔ وہی حال آدمی کا بھی ہے۔ جس کا جسم یعنے صورت تغیر پذیر ہے۔ روح یعنی حقیقت غیر فانی

اور مستقل ہستی ہے۔ جو اپنے تئیں ایسا سمجھ لیتا ہے۔ وہی صاحب استقلال کہا جاتا ہے۔ لہذا اس کو غیریت یا فنا کا وہم ہو ہی نہیں سکتا۔ مطلب مختصر یہ کہ جس طرح مَیں کا خیال بمقابلہ جسم کے نسبتاً دائمی ہونے سے بقاء رُوح کا ثبوت ہوتا ہے۔ ویسے ہی چونکہ مَیں کے خیال کا انحصار حس قوت آگاہی پر ہے۔ وہ بھی دیوانگی یا بیہوشی وغیرہ کی صورت میں اپنے تغیر پذیر ہونے کے واقعات دکھاتی ہے۔ اس لئے حقیقی معنوں میں رُوح وہ ہے جو کہ قوت آگاہی کی حدود سے بھی بالاتر ہے۔ بقول شاعر۔ ع۔

ہوش بھی جس پر پھٹک جائیں وہ سودا اور ہے۔

گویا ڈے کارٹے کے عقیدے کے بموجب جو روح شک کرنے والی ہے وہ حقیقی ہستی یعنے شک سے باہر نہیں ہے۔ بلکہ اصلی معنوں میں وہ رُوح ہے۔ جو کہ اہل ویدانت کی اصطلاح میں آتما کے نام سے بیان کی جاتی ہے اور من بُدھی سے بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ وہی ایک ناقابل تصور و تغیر چیتن ستا ہے۔ جسکو جاننے والا موت کے وہم سے چھوٹ جاتا ہے ÷ چونکہ ارجن کے اعتراضات کی تہ میں موت اور دُکھ کا خوف محرک پایا جاتا ہے۔ اس لئے زندگی کا راز بیان کرنے کے بعد بھگوان سُکھ دُکھ کی حقیقت ذیل کے الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں۔

(ب) سُکھ دُکھ کی اصلیت

(۱۴) ہے ارجن! حواس اور محسوسات کا تعلق ہی سردی گرمی کی طرح سکھ دُکھ کا باعث ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دونو امور عارضی اور تغیر پذیر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس لئے ان کو ثابت قدمی سے برداشت کر۔ (۱۵) جس شخص کو یہ بیقرار نہیں کرتے۔ اور جو صاحب استقلال سُکھ دُکھ کو یکساں سمجھتا ہے۔ وہی

زندۂ جاوید ہونے کا جوہر رکھنا ہے ۔

مطلب یہ کہ جس طرح سردی کی حالت میں گرمی اور گرمی کے موسم میں سردی راحت بخش ہوتی ہے۔ اور برعکس حالتوں میں ہر دو تکلیف دہ ہو جاتی ہیں ویسے ہی حواس اور محسوسات بھی خاص حالتوں میں باہم ملنے پر راحت بخش اور بصورت دیگر تکلیف دہ اثر پیدا کرتے ہیں۔ جیسے بھوک کی حالت میں جو کھانا لذیذ معلوم ہوتا ہے۔ شکم سیر ہونے پر نامرغوب یا قابلِ نفرت بن جاتا ہے۔ یا وہی محبوبہ جو کہ جذبہ شہوت کی تیزی کی حالت میں انتہائی راحت کا سامان نظر آتی ہے۔ جوشِ جوانی کے نکل جانے پر یا بحالت کمزوری ناخوشگوار صورت معلوم ہونے لگ جاتی ہے۔ چونکہ ایک حالت میں کسی شے کو قائم رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ بقولیکہ ؎

رہتا نہیں ہے طور زمانے کا ایک سا ۔ معلوم ہو گیا ہمیں لیل و نہار سے

چنانچہ مرغوب ترین کھانے اگر خاص عرصہ کے بعد سڑ جاتے ہیں۔ تو حسین ترین معشوق بھی چند سالوں میں مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح پژمردہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بمصداق ؎

حسن پر مغرور ہونا بے حسابی بات ہے ۔ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے

اس لئے سکھ دکھ کی دونو حالتوں کا بہار و خزاں کی طرح ہر شخص پر یکے بعد دیگرے وارد ہونا لازمی ہے۔ پس جس طرح موسمی تبدیلیوں کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے ہی سکھ دکھ کو بھی برداشت کرنا چاہیئے۔ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔ ؎

زرنج و راحتِ گیتی مشو خنداں مرنجاں دل
کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد۔

اسی اصول کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ چونکہ انسان کیلئے خاص درجے کی حرارت ہی راحت بخش ہو سکتی ہے۔ اس سے کم و بیش سردی اور گرمی دونو صورتوں میں تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت نہ صرف دنیا میں ہی برف سے لے کر آگ تک مختلف درجات کی حرارت پائی جاتی ہے بلکہ انسان خود بھی ایک ہی مصنوعی گرم یا سرد بنائے ہوئے کمرے میں بند نہیں رہ سکتا۔ گویا مختلف مقامات میں گھومنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے جس طرح بلحاظ سردی گرمی کے اس کو مختلف قسم کے حالات سے واسطہ پڑتا ہے ویسے ہی دیگر محسوسات کی صورت میں بھی اس کو لگاتار رنج و راحت کا احساس ہونا قدرتی امر ہے۔ کیونکہ ان کا بھی ایک ہی صورت میں قیام نہیں پایا جانا۔ پس خواہ بادشاہ ہو یا مزدور۔ دکھ سکھ دونو کو پیش آنا لازمی امر ہے۔ جس طرح گاڑی چلنے میں پہیئے کا چکر کھانا روکا نہیں جا سکتا۔ ویسے ہی زندگی گذارنے کے لئے کسی ایک حالت کو ہی قائم رکھنے کی فکر کرنا سراسر فضول ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے یہ خیال کرنا عین قرین عقل ہے۔ کہ نہ صرف دکھ کی حالت سکھ کے احساس کی تیزی کو ہی بڑھانے کا کام دینے والی ہے۔ بلکہ اگر انسان لگاتار مختلف قسم کے وشئے سکھ میں ہی غلطان رہے۔ تو جہاں ایک طرف اس کی طبیعت کا اکتا جانا ہی ممکن ہے۔ وہاں دوسری طرف اس کے من اور حواس میں ایسی کمزوری پیدا ہو جانا بھی یقینی امر ہے۔ جس سے وہ سکھ کو محسوس ہی نہ کر سکے۔ حتےٰ کہ وہی اشیاء جو اسے پہلے راحت بخش محسوس ہوتی ہیں بعد میں بالکل پھیکی ہو کر موجب کلفت بن جاتی ہیں۔ جیسے افیون یا شراب وغیرہ پہلے تو خاص مقدار میں سرور انگیز ہوتی ہیں۔ لیکن عادت بننے پر نہ صرف

ان میں کچھ سرور ہی نہیں ملتا۔ بلکہ طرح طرح کی امراض کا موجب ہو جاتی ہیں لہذا مہاراجہ ججاتی کے قول کو مدنظر رکھتے ہوئے جس نے اپنے بیٹے کی جوانی کا ہزار برس تک لطف اٹھا کر آخر پشیمانی کے ساتھ اس امر کا اقرار کیا تھا کہ "سکھوں کے بھوگنے سے وشئے باسنا کی ترپتی نہیں ہوتی۔ بلکہ جس طرح ہون کے پدارتھوں سے آگ بھڑکتی ہے ویسے ہی خواہشات کی آگ بھی زیادہ ہی ہوتی جاتی ہے۔" (مہابھارت آدپرب $\frac{۷۵}{۴۹}$ منو $\frac{۲}{۹}$)
ہمیں اپنی خواہشات کا رخ بجائے خیال راحت کے ادائیگی فرض کی طرف*

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

علاوہ ازیں جس طرح ایک ہاتھ کو برفانی اور دوسرے کو گرم پانی میں رکھنے کے بعد اگر دونو کو معمولی کنوئیں کے پانی میں ڈالا جاوے۔ تو وہی ایک ہاتھ کو گرم اور دوسرے کو سرد معلوم ہوتا ہے ویسے ہی جس شخص کو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہو۔ اسے اگر ڈیڑھ سو روپیہ کردی جاوے۔ تو راحت کا موجب ہوگی۔ لیکن جس کو پہلے دو سو روپیہ ملتی ہو۔ پھر ڈیڑھ سو کردی جائے اس کے لئے باعث کلفت ہوگی۔ گویا سردی گرمی کے احساس کی طرح سکھ دکھ کا احساس بھی انسان کی ذہنی حالت پر ہی منحصر ہے۔ جو شخص اپنے تئیں خاص بیرونی حالات سے باندھ نہیں لیتا۔ اسکو ان دونو حالتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لہذا بے تعلقی کی زندگی بسر کرتے ہوئے انکو یکساں سمجھنا چاہیئے۔ چونکہ راحت کی حقیقت پر فلسفہ اتحاد حصہ اول میں ہر پہلو سے بالتفصیل بحث کی جا چکی ہے۔ اس لئے بخوف طوالت یہاں اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اور سرشت انسانی کے تیسرے عنصر یعنی عقلی کمال کی

جو حق و باطل کی تمیز حاصل ہوتی ہے۔ اس کے متعلق بھگوان نے جو فرمایا ہے۔ اس پر غور کیا جاتا ہے۔

(ج) حق و باطل کی ماہیت

(۱۶) جو نیستی ہے وہ ہستی نہیں رکھتی اور جو ہستی ہے وہ نیست یعنی معدوم نہیں ہو سکتی۔ ان دونو کی حقیقت تتو درشی اصحاب نے ہی دیکھی ہے

مطلب یہ کہ دنیا میں بلحاظ تغیر پذیر اور لاتغیر ہونے کی صورت اور حقیقت نامی دو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک صورت نہ صرف مختلف حالات میں (مثلاً حواس و خیال کے اختلاف پر) مختلف طور پر معلوم ہی ہوتی ہے۔ بلکہ در حقیقت کوئی ہستی بھی نہیں رکھتی۔ یعنی محض خیالی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے سونے کے زیورات سونے سے علیحدہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اور برخلاف اس کے دائمی اور لاتبدیل حقیقت خواہ ظاہری حواس اور خیال سے کیسی ہی مخفی کیوں نہ ہو جائے۔ لیکن وہ اصل معدوم کبھی نہیں ہوتی۔ جیسے لیمپ کا تیل جل جانے پر دوسری پوشیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یا سورج کی حرارت نباتات کی وساطت سے حرارت غریزی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان صداقتوں کو اہل سائنس نے ناقابل تردید تجربات سے ثابت کر دیا ہے۔ لہذا جو اہل مذہب نیستی سے دنیا کا وجود میں آنا مانتے ہیں وہ حقیقت کو دیکھنے سے محروم ہی رہنے چاہئیں۔ ایسے ہی جو لوگ اہل ویدانت پر یہ سوال کیا کرتے ہیں۔ کہ "اودیا" کہاں سے آگئی؟ وہ بھی حقیقت سے بے بہرہ ہونے پر ہی دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ اودیا دراصل علم کی نیستی کا نام ہے۔ لہذا وہ ہست ہو ہی کیسے سکتی ہے؟ جیسے اندھیرا روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے نہ کہ کسی شے کے ہونے کا۔

اس لیئے وہ کہیں سے آ کیسے سکتا ہے؟ آنا جانا نورشتی کا ہی ہو سکتا ہے
جو کہ بذات خود ہستی رکھتی ہے۔ گیتا کا یہ شلوک ایک معنوں میں تمام
سائنٹیفک سچائیوں کی جان ہے۔ گویا جیسے کرم کا مسئلہ قانون علت و
معلول اور آواگون کا مسئلہ قانون ارتقا کی تصدیق کرتا ہے۔ ویسے ہی
حق و باطل کی یہ تعریف علم طبعی و علم کیمیا یعنی طاقت اور مادہ کی نیلودی
لافانیت کی صداقت پر مُہر لگاتی ہے۔ اور ہندو رشیوں کے اس علمی کمال
پر پہنچنے کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ جو کہ مغربی محققین کو ہزاروں برس بعد
گزشتہ صدی میں حاصل ہُوا۔

دیگر۔ جس طرح صبح کچھ اور شام کو کچھ اور کہنے والا آدمی جھوٹا کہا جاتا ہے
ویسے ہی چونکہ ہر ایک جسمانی اور مادی ظہور یعنی صورت و سیرت دریا کے
پانی کی طرح لگاتار بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے جھوٹی یعنی نیست کہی جا سکتی ہے
اور برخلاف اس کے ذات حق جو ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے وہی ایک
ہست مطلق کہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ یہی صداقت ذیل کے دو شلوکوں
میں ظاہر کر کے ارجن کے اعتراض کا جواب دیتے اور یدھ کرنے کو حق بجانب
ثابت کرتے ہیں۔

(۱۷) لافانی تو اس کو جان۔ جس سے یہ تمام عالم محیط یا بھرپور ہے۔ اس
لازوال ہستی کو کوئی فنا نہیں کر سکتا۔ (۱۸) اس دوامی ہستی کے
جو کہ لافانی اور لامحدود ہونے سے حلقہ عقل میں نہ سمانے والی ہے۔ یہ
اجسام محدود اور فانی ظہور کہے گئے ہیں۔ اس لئے اے ارجن۔ تو جنگ کر۔
مطلب یہ کہ جسمانی صورت دمبدم تغیر پذیر ہونے کی وجہ سے ایک حالت
میں قائم رہ نہیں سکتی۔ اور روحانی حقیقت لاتبدل ہونے کی بدولت

فنا نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے سُکھ دُکھ اور زندگی و موت کو جسم کی خاص حالتوں سے وابستہ سمجھتے ہوئے تو اپنے تئیں موت اور دُکھ سے بالاتر خیال کر۔ اور بیخوف ہو کر جنگ کے لئے اُٹھ کھڑا ہو۔ گویا تیرا موت اور دکھ کے خیال سے ڈرنا در حقیقت خاص قسم کی غلط فہمی پر ہی مبنی ہے۔ جو کہ جسم اور رُوح یعنے صورت اور حقیقت میں تمیز نہ کرنے پر منحصر ہے۔ ورنہ جیسے کیمیائی مرکبات کے ٹوٹنے پر ان کے مفردات (ایٹم) بدستور قائم رہتے ہیں ویسے ہی اس تن من کے بظاہر معدوم ہونے پر آتما بغیر کسی تبدیلی کے اپنی ذات میں قائم رہتا ہے۔ یہی اہل عرفان کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ بقولیکہ۔

ح۔ جاونا آونا نہیں اوہنے کوہاں وانگ ہمیش اڈول ہے جی۔
جیویں بدلاں دے چلنے چند چلدا لگے بالکاں نوں ایہو بھول ہے جی۔
چلے دیہہ اندری من پران آدک اوہ دیکھنے ہار اڈول ہے جی۔
تُمے شاہ سمبھال خوشحال ہو جا عین عارفاندا ایہو بول ہے جی۔

چونکہ آتما کی حقیقت فلسفہ اعتدال کے چوتھے اور فلسفہ اتحاد کے تیسرے حصے میں بالتفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ اس لئے یہاں مختصر طور پر اشارہ کرنا ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ اگرچہ ایک معنوں میں گیتا کی تعلیم کا جوہر مذکورہ بالا آٹھ شلوکوں میں ہی ختم ہو گیا ہے اور تمام مسائل معرفت و حقیقت یعنے علمی اور عملی رموز مجمل طور پر ان میں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ مثلاً آتما لا فانی۔ لا تغیر لا محدود۔ ادراک و خیال سے بالاتر۔ حقیقی ہستی اور واحد مطلق ہے۔ اور اجسام برخلاف اس کے فانی تغیر پذیر۔ محدود اور بیشمار ہیں۔ جس طرح ایتھر یعنی آکاش ہر شے میں بھرپور یا محیط معلوم ہوتا ہے۔ ویسے ہی ایک ذات مطلق تمام اشیاء عالم میں جلوہ نما ہو رہی ہے۔ اس لئے انسان کو اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے خیال سے پاک

اور روحانی زندگی اختیار کرنا ہی بہترین اصول سمجھنا چاہیئے یعنے زندگی اور موت یا سُکھ اور دُکھ ہر دو حالتوں کو یکساں سمجھتے ہوئے ان کی طرف سے ویسے ہی لاپرواہ رہے۔ جیسے کوئی مسافر راستے کی دھوپ یا چھاؤں سے بے پرواہ ہو کر منزل مقصود کی طرف قدم اُٹھائے چلا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ارجن ایک سپاہی آدمی تھا۔ نہ کہ فلاسفر جس کے لئے مختصر اشارہ کافی ہوتا۔ اس لئے انہی نکات کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کی غرض سے بھگوان نے اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان فرمایا۔

رُوح کے اوصاف

(۱۹) جو شخص اس آتما کو قاتل سمجھتا ہے یا جو اسے قتل ہونے والا خیال کرتا ہے وہ دونو حقیقت حال سے بے خبر ہیں۔ کیونکہ نہ یہ کسی کو مارتا ہے اور نہ ہی کسی سے مارا جاتا ہے۔

(۲۰) یہ نہ کبھی پیدا ہوتا ہے۔ نہ مرتا ہے۔ نہ پہلے کبھی نیستی سے ہستی میں آیا ہے۔ اور نہ آئیندہ ایسا ہوگا۔ یہ ازلی وابدی۔ دوامی اور قدیمی ہستی جسم کے مارا جانے پر بھی نہیں ماری جاتی۔

(۲۱) ہے ارجن! جو شخص اس ذات حق کو لافانی ہمیشہ ایک جیسی رہنے والی نہ پیدا ہونے والی اور نہ بدلنے والی جانتا ہے۔ وہ کسی کو کیسے مار سکتا ہے؟ اور کس کو قتل کر سکتا ہے؟ مطلب یہ کہ جس طرح تغیر تبدل زیورات میں ہوتا ہے۔ نہ کہ سونے میں۔ ویسے ہی پیدائش و موت وغیرہ کی تبدیلیاں جسم میں ہوتی ہیں۔ نہ کہ آتما میں۔ اس لئے آتم گیان ہونے کی کسوٹی ہی یہ ہے۔ کہ انسان اپنے تئیں امر سمجھے۔ اور اپنی روح کو، وہ ذات مطلق خیال کرے۔ جو کہ بعالم بیداری خواب اور گہری نیند یعنے سہ حالتوں میں یکساں موجود رہتی ہے۔ لہذا انصاف یا دھرم کے کام میں کسی کی موت کے خوف سے باز نہ رہے۔ غرض یہ ہے

کہ چھوت چھات اور ذات پات کی طرح مرنے مارنے کا خیال بھی دھارمک نقطۂ نگاہ سے کچھ معنے نہیں رکھتا۔ یہ صرف مجلسی سوال ہے۔ اس لئے قومی بہتری کے خیال سے جو رستہ معقول اور مفید معلوم ہو۔ وہ اختیار کیا جا سکتا ہے چنانچہ اسی اصول پر ملکی جنگ میں سرفروشی اور قتل روا رکھا گیا ہے۔ جیسے اصطلاحاً جہاد یعنے راہ حق پر مرنے مارنے کے لئے کمر بستہ ہونا کہا جاتا ہے*

(۲۲) جس طرح پرانے کپڑوں کو چھوڑ کر انسان دوسری نئی پوشاک پہن لیتا ہے۔ ویسے ہی صاحب جسم ایک صورت کے خراب ہونے پر دوسری نئی صورت اختیار کر لیتا ہے*

اگرچہ عام طور پر اس مثال سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرنے پر شخصی روح ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت اگر سلسلۂ مضمون کو مدنظر رکھا جائے۔ تو یہ خیال سراسر غلط فہمی پر مبنی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے اسی صداقت کو شلوک نمبر ۱۳ میں دوسرے الفاظ میں یوں بیان کر آئے ہیں۔ کہ جس طرح بچپن کا جامہ چھوڑ کر جوانی کا لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔ ویسے ہی مرنے کے بعد دوسری صورت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں بھی یہی معنے لینے چاہئیں۔ کہ جس طرح بیج درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے یا موسم بہار کی آمد پر کہا جاتا ہے۔ کہ عروسان چمن نے نیا لباس بدلا ویسے ہی مرنا درحقیقت محض تغیر شکل کا نام ہے۔ چنانچہ اہل ہنود میں جو چوراسی لاکھ جونیوں میں سے گزر کر انسانی صورت ملنے کا خیال عام طور پر پایا جاتا ہے۔ وہ دراصل مسئلہ ارتقا کو ہی دوسری صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس ڈاروِن صاحب کے نام سے منسوب شدہ قانون کے ماننے والے بھی اس امر کے قائل ہیں۔ کہ انسان اور دنیا کی پیدائش قرآن یا انجیل کی تعلیم سے

بموجب لفظ کُن کہنے یا ایک ہفتے کی کوششوں کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ کروڑوں سال کی متواتر ترقی کرنے کا نتیجہ ہے اور حمل کی میعاد یعنے نو مہینوں میں ایک کیڑے جیسے آدمی کی صورت بننے میں وہ تمام ابتدائی مدارج مختصر طور پر اب بھی ہر شخص کو طے کرنے پڑتے ہیں۔ جن میں سے بحیثیت مجموعی نوع انسان گزر کر موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔ چونکہ اس مضمون کی نسبت فلسفہ اعتقاد کے تیسرے حصے میں بالتفصیل بیان کیا جا چکا ہے اس لئے یہاں پر صرف اشارہ ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے۔ کہ جس طرح ایک گھڑے کو باہر سے کمرے میں لانے پر اس کے اندر کا آکاش یعنے خلا ساتھ نہیں لایا جا سکتا۔ ویسے ہی جو شے سرودیاپک ہے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتی۔ لیکن اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے۔ کہ کیا دوسرے جنم پانے کا خیال غلط ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ عام لوگوں میں جو آواگون یا تناسخ کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ وہ تو محض اودیا پر ہی مبنی ہے۔ اور بقول شنکر آچاریہ جی کے علم حقیقی حاصل ہونے پر دور ہو جاتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے۔ کہ چونکہ مکتی یافتہ شخص اپنی پیدائشی دُنیاوی خود غرض اور گناہ آلودہ خصلت سے بر حمِ شکتی پا کر پاکیزہ آسمانی اور الہٰی خصلت میں تبدیل ہو جاتا ہے گویا ایک نئی زندگی پاتا ہے۔ جسمیں بجائے نفس (شیطان) کے پوتر آتما اس کے دل میں سکونت کرتا اور اس پر غالب ہو کر اس میں کام کرتا ہے تاکہ پرماتما کی مرضی اور اس کی خواہش کو پورا کرے۔ اس لئے اس کو دوج یا دوجنما کہا جاتا ہے۔ مسیح کی نسبت جو مشہور ہے کہ وہ مر کر جی اُٹھا۔ اور چوتھے آسمان پر چلا گیا۔ وہ درحقیقت اسی مفہوم کا مظہر ہے کہ وہ دوجنما ہو کر مکتی پا گیا۔ بغور دیکھیں تو اصل معنوں میں مُندھی کا مطلب بھی یہی ہے۔ جس کے لئے خاص سنسکاروں کی ضرورت

ہوتی ہے۔ کیونکہ پیدا تو ہر شخص شودر ہی ہوتا ہے۔ بہر حال یہی بلحاظ دیش کال اور وستو کے غیر متغیر ہونے کا خیال مندرجہ ذیل شلوکوں میں واضح کیا گیا ہے۔

(۲۳) شستر یا ہتھیار اس کو کاٹ نہیں سکتے۔ آگ اس کو جلا نہیں سکتی۔ پانی اس کو گلا نہیں سکتا۔ اور نہ ہی ہوا اس کو سکھا سکتی ہے۔

(۲۴) یہ نہ کٹنے والی۔ نہ جلنے والی۔ نہ گلنے والی۔ اور نہ سوکھنے والی ہستی ہے۔ بلکہ ہمیشہ اور ہر جگہ رہنے والی۔ مستحکم۔ غیر متحرک اور قدیمی ہے۔ گویا جس طرح شیر اپنے تئیں ڈرا نہیں سکتا۔ ویسے ہی اربعہ عناصر اپنی ذات خاص کو جو کہ ان کے تمام ظاہری اوصاف کی تہ میں مخفی رہتی ہے۔ کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ جو شے مکانی زمانی اور نفسانی قیود سے پاک ہو۔ اس میں تبدیلی آ ہی کیسے سکتی ہے؟ اگرچہ مغربی سائنس کے نقطۂ نگاہ سے یہی مضمون مادے کی ہستی پر بھی عائد ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ اشیا، عالم میں جڑ مادے کے ساتھ حرکت اور آگاہی نامی دو ایسے خواص بھی مشاہدے میں آتے ہیں۔ جن کا تصور مادے کے تصور سے علیحدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں پر اس ذات حق کی طرف ہی اشارہ سمجھنا چاہیئے۔ جو کہ ان ہر سہ امور کی تہ میں جلوہ نما ہونے سے مایا کے تینوں گنوں سے بالاتر کہی جاتی ہے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف علم حقیقی کا مفہوم ہی کثرت سے گزر کر وحدت حقیقی تک پہنچتا ہے۔ وہاں دوسری طرف یہ ہر سہ امور عالم خیال میں بآسانی تمیز کئے جا سکتے ہیں۔ صرف ذات مطلق ہی ہے جو کہ عالم خیال سے بالاتر یعنے اچنتیہ کہی جا سکتی ہے چنانچہ یہی خیال ذیل کے شلوک میں ظاہر کیا گیا ہے۔

(۲۵) یہ آتما محسوسات تصورات اور تغیرات کی حدود سے باہر ہے۔ اس لئے اس کو ایسا جان کر تمہارے لئے افسوس کرنا مناسب نہیں ہے ❖

مطلب یہ کہ ذات مطلق حواس وخیال اور عقل میں نہیں سما سکتی لہٰذا کثیف لطیف اور الطف ہر سہ حالتوں سے بالاتر ہے۔ چونکہ موت اور دُکھ پاگناہ اور تعظیم کے خیالات جن پر تمہارے اعتراضات قائم ہیں وہ اس بُنیادی وحدت کا خیال آتے ہی یوں کافور ہو جاتے ہیں۔ جیسے روشنی کے سامنے اندھیرے کی حالت ہوتی ہے اس لئے اس حقیقت سے واقف ہونے پر کوئی معقول وجہ نہیں رہتی۔ جو کہ یُدھ میں حصّہ لینے کے مانع ہو۔ پس تمہیں ہر قسم کا فکر چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہونا چاہئیے ❖

چونکہ رُوح کی نسبت عام لوگوں میں تین قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں اوّل وہ جو کہ اسے جسم کے ساتھ فنا ہونے والی شے نہیں مانتے دوم وہ جو کہ اسے جسم کے ساتھ ہی فنا ہونے والی مانتے ہیں۔ سوم وہ جو کہ اس کی ابتدا و انتہا کی نسبت ناواقفیت کا دم بھرتے ہیں۔ اس لئے پہلے خیال پر زور دینے کے بعد اب دوسرے اور تیسرے عقیدے کی بنا پر ارجن کے اعتراض کا جواب دیتے ہیں۔

(۲۶) اور اگر تم اسے ہمیشہ پیدا ہونے اور مرنے کے اوصاف والا مانتے ہو ہے ارجن! تب بھی تمہیں افسوس کرنا واجب نہیں۔

(۲۷) کیونکہ جو پیدا ہوا ہے اُس کے لئے موت یقینی امر ہے۔ اور مرنے والے کے لئے پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے جس بات کا روکنا ناممکن ہو۔ اس کے لئے تمہارا فکر کرنا معقول نہیں کہا جا سکتا ❖

مطلب یہ کہ اہل سائینس کی طرح اگر تم زندگی کا انحصار میٹابولزم نامی کیمیائی

تبدیلیوں پر خیال کرتے ہو۔ تو بھی موت کا فکر بے سود ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد بھی کیمیائی تغیرات جاری ہی رہیں گے۔ ایک صورت میں نہ سہی۔ دوسری صورت میں سہی۔ پس فکر کرنے سے کیا حاصل؟ علاوہ ازیں دیگر امر یہ ہے۔

(۲۸) ہے ارجن! یہ اجسام آغاز میں بھی غیر محسوس ہوتے ہیں اور انجام میں بھی غیر محسوس ہوتے ہیں۔ محض درمیانی حالت میں حواس سے جانے جا سکتے ہیں۔ اس لئے ان کی نسبت افسوس کرنے کے معنے ہی کیا ہیں؟ مطلب یہ کہ نہ جن کے شروع کا حال معلوم ہو۔ کہ کہاں سے آئے ہیں؟ اور نہ انتہا کی نسبت خبر ہو۔ کہ کدھر چلے گئے ہیں؟ صرف سرائے کے مسافروں کی طرح عارضی ملاقات ہو۔ ان کی علیحدگی کے خیال سے بے چین ہونا عقلمندی پر دلالت نہیں کرتا۔ بہرحال خواہ اہلِ مذہب کی طرح آتما کو لافانی سمجھو۔ یا اہل سائنس کی طرح لگاتار تبدیل ہونے والی صورت خیال کرو خواہ "نیتی نیتی" کہنے والے اہل فلسفہ (اگنا سٹک) کی مانند علم ذات کا حصول ناممکن مانو۔ یہ کسی طرح پر ثابت نہیں ہوتا۔ کہ موت سے کسی کی ذات کو کچھ نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے راہ حق یعنے فرض کی ادائیگی میں اگر کسی کو مارنا پڑے۔ تو تشویش و رنج میں مبتلا ہونا معقولیت سے سراسر بعید ہے۔

(۲۹) کوئی (عارف) اس روحانی صداقت کو حیرت انگیز طور پر دیکھتا یعنی انبھو کرتا ہے۔ اور کوئی دوسرا (فلاسفر) متعجبانہ پیرائے میں اس کی نسبت بیان کرتا ہے اور کوئی دوسرا (سائنسدان) اسے تعجب سے سنتا ہے۔ لیکن محض سننے سے اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔

جو شے خلاف معمول اوصاف سے موصوف نظر آتی ہے وہی باعث حیرت ہُوا کرتی ہے۔ چونکہ ذات حق ان تمام صورتوں سے بالکل مختلف ہے۔ جو کہ روزمرہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس لئے اس سے بڑھ کر دُنیا میں اور کوئی حیرت انگیز امر ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اسی لئے اس کا دیکھنا۔ بیان کرنا۔ اور سُننا تعجب خیز طریقے پر ہوتا ہے باقی رہی یہ بات۔ کہ "محض سُننے سے اس کو کوئی نہیں جان سکتا" اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح جسمانی غذا کے لئے ہاضمہ۔ جاذبہ اور ساختہ نامی تین عمل ضروری ہیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ طاقت بدنی کی صورت اختیار کرے۔ ویسے ہی اس اعلےٰ درجے کی تعلیم کے لئے بھی ساکشات ہونے سے پہلے (جیسا کہ ارجن کو بشوروپ کے درشن ہوئے تھے) شردن منن اور ندھیاسن نامی تین منزلوں سے گزرنا ضروری ہے۔ صرف سُن لینا ہی کافی نہیں۔ کیونکہ بیان کرنے والے کی قابلیت اور سُننے والے کی لیاقت کے علاوہ اوّل تو یہی امر مسلمہ ہے۔ کہ دُنیا کی کوئی بھی زبان تمام تجربات انسانی کو پورے طور پر ظاہر کرنے کے لئے کافی الفاظ نہیں رکھتی۔ جیسے گُڑ بھی میٹھا اور کھانڈ بھی میٹھی۔ دونو کا فرق کسی طرح پر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دیگر یہ تو حقیقت ہی دُنیا سے نرالی ہے اس لئے بمصداق رع لطف این بادہ ندانی بخدا تانہ چشی۔ جب تک خود انھوں نہ کی جاوے۔ کسی طرح پر سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ پس سُنی ہوئی باتوں کے ہر پہلو پر غور کرنا (تاکہ کسی قسم کی خیالی غیر مطابقت نہ رہے) اور پھر ان کو عمل میں لاکر آزمانا (تاکہ واقعات عالم سے اس کی تصدیق ہو سکے) تحقیق حق کے لئے لازمی امور ہیں۔ انہی مدارج کو دوسرے الفاظ میں علم الیقین کے بعد عین الیقین اور حق الیقین کا نام دیا گیا ہے یا گیتا کی اصطلاح میں معمولی

آنکھوں سے دیکھنے کے علاوہ گیان چکشو اور دویہ چکشو سے کام لینا کہا گیا ہے۔ بصورت دیگر غیر منہضم غذا کی طرح محض سُننا نہ صرف کچھ فائدہ ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اکثر اوقات آنتوں میں سڑنے والی خوراک کی طرح غرور بے جا اور تعصب دشمنی وغیرہ کی صورت میں کئی قسم کے نقصان بھی پہنچاتا ہے

۵ علم چندانکہ بیشتر خوانی ۔ چوں عمل در تو نیست نادانی
نہ محقق بود نہ دانشمند ۔ چارپائے برو کتابے چند

جس شخص پر یہ حقیقت کھل چکی ہے۔ اس کو یہی نظر آتا ہے کہ

(۳۰) تمام اجسام میں یہ صاحب جسم دوامی اور لافانی ہے۔ اس لئے کسی کے متعلق بھی تمہیں فکر کرنا زیبا نہیں +

یہاں تک سرشت انسانی کے تین پہلوؤں پر غور ہو چکا ہے۔ اور جسم دل اور دماغ سے تعلق رکھنے والے تین نہایت ضروری امور یعنے زندگی و موت سکھ و دُکھ اور حق و باطل کی تشریح کی جا چکی ہے اب چوتھے پہلو یعنے ارادے سے تعلق رکھنے والی کیفیت کا بیان کیا جاتا ہے جس کو نیکی و بدی کے نام سے پکارا جاتا ہے تاکہ اس صداقت کو جاننے کے بعد کہ "مرنے سے روح کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا" بلا تکلف کسی کو قتل کرنے یا قتل ہونے کے لئے تیار نہ ہو جانا چاہیئے۔ بلکہ یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ مرنے یا مارنے کے لیئے کون سی حالت موزون کہی جا سکتی ہے؟

نیکی و بدی کی تعریف

(۳۱) اور اگر تم اپنے دہرم (ڈیوٹی = فرض) کی طرف دیکھو۔ تو بھی تمہیں کانپنا نہیں چاہیئے کیونکہ کشتری کے لیئے دہرم یُدھ سے بہتر (شریہ) اور کچھ نہیں ہے +

چونکہ انسان شہد کی مکھی کی طرح مجلسی ہستی ہے! در مجلسی زندگی قائم رکھنے کے لئے تقسیم محنت ایک نہایت ضروری عنصر ہے یعنے ہر فرد قوم اعضاء بدنی کی طرح اپنے فرائض کو بلا تکلف ادا کرے۔ اس لئے اگرچہ درحقیقت ہر شخص کا دھرم اپنا اپنا ہی ہوتا ہے تاہم بحیثیت مجموعی جس طرح علمی تحقیقات کے لئے برہمن اور دھن دولت پیدا کرنے کے لئے ویش اور خدمتگزاری کے لئے شودر کو ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ اور ان کی عزت و نیکنامی اسی عمل پر مبنی ہے ویسے ہی کشتری کا فرض یہ ہے۔ کہ انصاف اور حق کا اصول قائم رکھنے کے لئے مرنے مارنے سے نہ ڈرے۔ اسی میں اس کی دین و دنیا کی بھلائی مخفی ہے ورنہ گڑبڑ ہونے سے نہ تو سوسائٹی کا قیام ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی فردی طور پر کوئی اطمینان پا سکتا ہے۔ مطلب بہر حال یہ ہے کہ جنگ اور قتل صرف اسی صورت میں جائز ہے۔ جبکہ دھرم اور انصاف خطرے میں ہو۔ بمصداق۔ سہ

انسان اگر لڑے تو اصولونکے واسطے۔ کانٹوں میں ہاتھ ڈالے تو پھولونکے واسطے

گو بعض اصحاب کی یہ رائے ہے کہ جس سپاہی نے اپنی مرضی سے کسی کی ملازمت اختیار کی ہو اس کا ایسی جنگ میں حصہ لینا فرض ہو جاتا ہے جو کہ اس کا حاکم لڑنا شروع کرے۔ لیکن یہاں یہ نہیں کہا گیا۔ بلکہ برخلاف اسکے یہ پایا جاتا ہے کہ اگر کسی سپاہی کی ضمیر یہ محسوس کرے۔ کہ جس جنگ میں اسے لڑنے کے لئے حکم ملا ہے وہ محض لوٹ مار یا دوسری قوموں کو غلام بنانے کی غرض سے ہے۔ یعنے مساوات کے اصول کے منافی ہونے سے دھرم کے برخلاف ہے تو وہ بلا تکلف مستعفی ہو سکتا ہے خواہ جان پر ہی کھیلنا پڑے۔ لیکن دھرم کی خاطر یدھ کرنے سے اسے

کبھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہئیے۔ غرضیکہ خواہ مارنا پڑے یا مرنا۔ ہر دو صورتیں دہرم کی خاطر اختیار کرنی چاہئیں۔ یعنے انسان کا فرض ہے کہ وہ پاپیوں کے قتل سے احتراز کرنا تو درکنار۔ اپنی راحت اور زندگی کی نسبت بھی دہرم کو زیادہ قیمتی سمجھے۔ بقولیکہ ؎

سورا سوئی جانئے جو لڑے دین کے ہیت۔ پرزہ پرزہ کٹ مرے کبھی نہ چھوڑے کھیت

چنانچہ اسی دلیل پر ہم گیتا کو محض راج نیتی کی کتاب نہیں کہتے۔ بلکہ دہرم کا راستہ دکھانے والی اور انصاف کا راج لانے یا مکتی کا سادھن بنانے والی تسلیم سمجھتے ہیں:۔ اب خود حفاظتی کو دہرم کا عنصر ظاہر فرماتے ہیں

(۳۲) ہے ارجن! جو لڑائی خود بخود یعنے بغیر اپنی خواہش کے پیش آگئی ہو وہ انصاف پر مبنی ہونے کی صورت میں سورگ کا کھلا دروازہ ہے۔ اس لئے وہ کشتری بہت خوش قسمت ہیں۔ جن کو ایسے میدان میں جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔

مطلب یہ کہ عام طور پر جو جنگ کئے جاتے ہیں۔ وہ حکمرانی کی ہوس کو پورا کرنے اور زر و زن وغیرہ کی لوٹ مار کے خیال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن یہ لڑائی اپنا حق حاصل کرنے اور ظالموں کو مارنے بالفاظ دیگر دہرم اور انصاف کے لئے کی جا رہی ہے۔ اس لئے جو سپاہی ایسی جنگ میں حصہ نہیں لیتا۔ وہ بلا شبہ ویسا ہی ہے۔ جیسا کہ کوئی بیوقوف بہشت میں داخل ہونے سے انکار کر دے۔ درانحالیکہ اس کے پھاٹک کھول دئے گئے ہوں۔

(۳۳) پس اگر تم یہ دہرم یدھ نہیں کرو گے۔ تو اپنے دہرم اور نیکنامی کو مٹا کر پاپ کے ہی حصہ دار بنو گے۔

مطلب یہ کہ کسی واجب القتل کو جان سے مارنا پاپ نہیں۔ بلکہ پاپ سے مراد انسان کا اپنے فرائض کو ادا نہ کرنا یا برخلاف اس کے ایسے کام کرنے سے ہے۔ جو کہ اس کے اپنے فرض سے تعلق نہیں رکھتے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ نیکی یا بدی کسی خاص عمل کا نام نہیں بلکہ اس کا انحصار انسان کی نیت پر ہوتا ہے وہی کام جو ایک حالات میں بُرا یا گناہ ہوتا ہے وہی دوسرے حالات میں اچھا یا ثواب بن جاتا ہے۔ جیسے جسمانی صحت کی حالت میں سنکھیا یا شراب وغیرہ کا استعمال نقصان پہنچاتا ہے لیکن خاص امراض کی حالت میں وہی مفید ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی عام طور پر قتل کرنا بُرا ہے۔ لیکن جب کوئی ڈاکو یا قاتل جج کے سامنے لایا جاتا ہے تو اس کو پھانسی کی سزا دینا اس کا دہرم ہو جاتا ہے اسی اصول کو مہابھارت میں دہرم ویادھ کی کہانی سے ذہن نشین کرایا گیا ہے ۔

(۳۴) نیز لوگ ہمیشہ کے لئے تمہاری مذمت کریں گے۔ اور صاحب عزت کے لئے بدنامی موت سے بھی بدتر ہوتی ہے ۔

مطلب یہ کہ گو عام لوگ موت سے خوف کھاتے ہیں۔ تاہم نہ صرف اکثر کمزور طبع اشخاص ہی مصیبتوں سے بچنے کے لئے مرنا پسند کر لیتے ہیں۔ بلکہ مضبوط دل والے معزز شخص بھی بدنامی کے مارے لیا اوقات اس کا سہارا لے لیتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بدنامی کا دکھ اس سے بھی بُرا ہے۔ دیگر بالعموم انسان کو یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ اس کی تمام تکالیف موت کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔ لیکن بدنامی نہ صرف موت کے بعد جاری ہی رہتی ہے۔ بلکہ علاوہ اس خیال کے کہ بدی کی سزا دوزخ میں ملیگی۔ گنہگار شخص کو مرنے کے خیال پر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ گویا اس کے لئے

موت بھی اپنا شانتی بخش اثر کھو بیٹھتی ہے۔ غرض یہ ہے۔ کہ جس گناہ اور بدنامی کے خیال سے تم جنگ سے باز رہنا چاہتے ہو۔ وہ یُدھ نہ کرنے پر بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑے گا ۞

(۳۵) بہادر لوگ یہ سمجھینگے۔ کہ تم خوف کے مارے میدان سے بھاگ گئے ہو۔ اور جن کے دل میں تمہاری جوانمردی کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے وہ تمہیں حقیر خیال کریں گے ۞

مطلب یہ کہ ہر شخص تمہاری قلبی حالت کو نہیں جان سکتا۔ اس لئے یہ کوئی نہیں کہے گا۔ کہ تم رحم کے جذبے کے زیر اثر یا گناہ اور قومی تباہی وغیرہ کے خیال سے نہیں لڑے۔ بلکہ عام لوگ یہی خیال کریں گے۔ کہ بھیشم اور درونا چاریہ وغیرہ زبردست بہادروں کے مقابلے میں آنے سے ڈر گئے ۞

(۳۶) تمہارے دشمن تمہاری طاقت کی مذمت کرتے ہوئے بہت سی ناگفتنی باتیں کہیں گے۔ بھلا اس سے بڑھ کر اور کیا دُکھ ہو سکتا ہے؟

مطلب یہ کہ جب اپنے دوستوں میں بھی انسان کو بیقدر رہونا سخت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تو پھر دشمنوں کی طرف سے جھوٹی بدنامی برداشت کرنا کیسے ممکن ہوگا؟ علاوہ ازیں کوئی سنیاسی مہاتما تو شاید اپنی شان میں نامِلائم الفاظ سنکر بھی لاپرواہ ہو رہے۔ لیکن ایک بہادر کشتری کے لئے کمزوروں سے طعن و تشنیع سہنا بمقابلہ دشمن کو لڑائی میں مارنے کی تکلیف کے بدرجہا زیادہ دُکھ دینے والی بات ہوگی۔ اس لئے اس کو کیسے برداشت کر سکو گے؟

(۳۷) اگر شہید ہو گئے۔ تو سورگ میں جاؤ گے۔ اگر فتح حاصل کی۔ تو

راج کا سُکھ حاصل ہوگا۔ اس لئے ہے ارجن! یُدھ کے لئے مصمم ارادہ کرکے اُٹھ کھڑا ہو۔

مطلب یہ کہ دُنیاوی تکالیف سے بچنے اور نفسانی راحتوں کے حصول کا خیال بھی اسی امر کا تقاضا کرتا ہے۔ کہ سچے دل سے دہرم یُدھ میں حصّہ لیا جاوے الغرض ارجن کی تمام دلائل کا ایک ایک کرکے جواب دیا گیا۔ چنانچہ پہلے تو (۱) رنج و غم کو بعید از معقولیت ثابت کیا۔ (۲) پھر گناہ اور نیکنامی کی شہرت پر داغ لگنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور قومی ترقی کے لئے دہرم کا پالن کرنا ضروری ظاہر کیا۔ (۳) اس کے بعد طعن و تشنیع کی تکلیف کا ناقابل برداشت دُکھ بیان کیا۔ (۴) آخرکار جنگ میں مارا جانے یا فتح پانے کی ہر دو صورتوں میں دُکھ کے دُور ہونے اور سُکھ کے ملنے کا یقین دلایا۔ گویا جیسے اس نے لڑائی کرنے کے نقصان بیان کئے تھے۔ ویسے ہی بھگوان نے اس کے دوسرے پہلو کو سامنے رکھ کر فوائد ظاہر فرمائے۔ اور جنگ نہ کرنے کی صورت میں طرح طرح کے نقصان دکھائے۔ مثلاً عقلمندی کی جگہ جہالت کا اظہار ہوگا۔ نیکی و نیکنامی کی جگہ پاپ اور بدنامی پیش آئے گی۔ بہادری کی جگہ ذلّت رُونما ہوگی۔ اور سُکھ کی جگہ دُکھ بھوگنا پڑے گا۔ اس طرح پر جنگ کے روشن اور تاریک ہر دو پہلوؤں کو مدِّنظر رکھ کر آخری فیصلہ یوں کیا۔

(۳۸) سُکھ دُکھ۔ نفع نقصان اور فتح شکست کو برابر سمجھ کر یُدھ کرو۔ اس طرح پر تمہیں کوئی پاپ نہیں ہوگا۔

مطلب یہ کہ جس طرح علمی نقطۂ نگاہ سے تیسویں شلوک میں بقاء روح کا فیصلہ کیا تھا۔ ویسے ہی عملی نقطۂ نگاہ سے ہر پہلو پر بحث کرکے آخری نتیجہ یہ نکالا۔ کہ چونکہ رنج و راحت کا امکان ہر حالت میں یکساں ہے۔ اسلئے

کسی خاص بیرونی غرض کو مدنظر رکھ کر کام کرنا درست نہیں۔ بلکہ محض اپنا فرض
سمجھ کر کام کرنا ہی راہ راست ہے۔ کیونکہ دہرم کرنے پر ہی ادہرم یعنے پاپ سے
انسان بچ سکتا ہے۔ پس گیتا کی تعلیم کا انحصار بلحاظ گیان اور کرم کے صرف
دو جملوں میں ہی ہے۔

(۱) آتما کو اناشتی اور سرودیاپک دیکھنا۔ (۲) اپنے فرض سے فرض کی خاطر
پیار کرنا۔ ؎

لب آشنا دعا ہو نہ ماسوا کے لئے ۔ پکاریئے جو خدا کو تو بس خدا کے لئے

علاوہ ازیں ایک خاص سبق جو اس تعلیم سے ملتا ہے وہ یہ ہے۔ کہ اگرچہ
فطرتاً انسان زندگی۔ راحت۔ علم اور آزادی کا طالب نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت
نہ صرف ان کے متضاد امور ان کے آگے پیچھے ہی نمایاں طور پر موجود ثابت
ہوتے ہیں۔ یعنے دن اور رات کی طرح یہ ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے
ہیں۔ بمصداق ؎

دلا منال ز شامے کہ صبح درپے اوست ۔ کہ نیش و نوش بہم باشد و نشیب و فراز

بلکہ جس طرح دنیا میں کوئی شے بھی یک پہلو نہیں۔ ویسے ہی ٹھیک ایک ہی
وقت میں بھی جہاں ایک طرف ہر ایک فعل میں نیکی کے ساتھ بدی کا عنصر
شامل پایا جاتا ہے۔ وہاں دوسری طرف زندگی کے ساتھ موت۔ سکھ کے
ساتھ دکھ۔ علمی ترقی کے ساتھ حلقہ جہل کا بڑھنا۔ اور آزادی کے ساتھ
پابندی کا بھی لازمی تعلق ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس طرح میٹابولزم
کے عمل سے زندگی کے ظہور کا دار و مدار کیمیائی مرکبات بدنی کے ٹوٹنے
یعنے مرنے پر ثابت ہوتا ہے ویسے ہی احساس راحت کا انحصار دکھ کی
موجودگی پر پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ فلسفہ اعتدال کے پہلے حصے میں صفحہ ۳۶

باوضاحت بیان کیا جا چکا ہے۔ گویا وہی حالت جو ایک پہلو سے زندگی اور راحت وغیرہ کی صورت میں نظر آتی ہے دوسرے پہلو سے موت اور دُکھ وغیرہ کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا اصلی معنوں میں یہ عالم ایک ایسی تصویر سے مشابہ ہے۔ جس میں وحدت حقیقی دوئی کے رنگ میں جلوہ نما ہو رہی ہے۔ گویا ایک ہموار کاغذ پر مصور نے ایک طرف بلند ترین پہاڑوں کا سلسلہ دکھلانے کے ساتھ ہی دوسری طرف نہایت گہرے غاروں کا نقشہ دکھایا ہے یا جس تصویر کو دائیں طرف سے دیکھنے پر گائے اور بائیں طرف سے دیکھنے پر شیر دکھائی دیتا ہو۔ یہی صداقت مختلف محققین نے پورش و پرکرتی یا روح و مادہ وغیرہ کے نام سے ظاہر فرمائی ہے۔ اس لئے کسی خاص شے سے دلبستگی نہ رکھتے ہوئے فرائض منصبی کا ادا کرنا یعنے ہر حالت کو مساوی سمجھنا ہی انسانی کمال کا صحیح نشان ہے اور اسکی سچی شانتی کا انحصار اسی امر پر ہے۔ کہ کسی خاص شے کی خواہش نہ رکھے۔ بلکہ جیسی حالت بھی پیش آ جائے۔ اس کے روشن اور تاریک پہلوؤں کا موازنہ کرکے یکساں مطمئن رہے۔ بمصداق ؎

راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے
یاں یوں بھی واہ واہ ہے اور ووں بھی واہ واہ ہے

مطلب یہ کہ اس دنیا میں بظاہر کوئی شے یا حالت ایک دوسرے کے مشابہ نہ ہوتے ہوئے بھی بلحاظ روشن اور تاریک پہلوؤں یعنے نفع اور نقصان دینے والی ہونے کے درحقیقت ویسی ہی ہے۔ اس لئے رازدانِ حقیقت یعنی تتو درشی اگر وہی کہا جا سکتا ہے جو کہ توحید ذاتی کا قائل ہو۔ تو مرد کامل اس کو کہتے ہیں جو کہ عالم واقعات یعنے امیری و غریبی وغیرہ متضاد حالات میں سم درشی ہو۔

بمصداق۔ ؎

سُکھ دُکھ دونو سم کر جانے اور مان اپمانا ۔ ہر کھ شوک سے ہے اتیتا تن جگ تتو پچھانا

چونکہ من کی اس سمتا کی حالت کو یوگ کہتے ہیں۔ اس لئے اب اس کی نسبت اظہار خیالات کرتے اور ان ہر دو قسم کی پابندیوں سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ جو کہ طبیعت اور عادت کی غلامی کی صورت میں اس راہ حق پر چلنے میں سدراہ ہوتی ہیں۔

گیتا کے مضامین کی تقسیم (۴۹) یہاں تک تجھے سانکھیہ کی اصلیت سمجھائی ہے۔ اب یوگ کی حقیقت سُن۔

جس کے ذہن نشین ہونے پر اے ارجن! تو کرم بندھن سے آزاد ہو جائے گا۔ یہ شلوک گیتا کے مضامین کی تقسیم کرنے اور ان کا جوڑ توڑ دکھانے کے لحاظ سے نہایت معنے خیز ہے۔ غالباً اسی کی بنا پر ہر ایک ادھیائے کے آخری سنکلپ میں بھگوت گیتا کو برھم ودیا کی بنیاد پر قائم کردہ یوگ شاستر کہا گیا ہے۔ گویا بلحاظ علم و عمل کی مطابقت اور ذات و صفات کی وحدت ثابت کرنے کے ایک ہی صداقت کو سانکھیہ اور یوگ کے نام سے تقسیم کر کے بھگوان نے ارجن کو مکتی کا صحیح تصور دلا کر عارف کامل بنا دیا۔

مطلب یہ کہ سرشت انسانی کے چاروں پہلوؤں کے نفع و نقصان پر غور کرتے ہوئے ہم آہنگی کا راستہ اختیار کرنا انسان کا فرض اعظم ہے۔ چونکہ فطرتاً انسان میں کئی قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے ان کو دور کرنے کے لئے اسے کرم تو ضرور کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جس طرح اکثر اشخاص مرض پیچش کے علاج کی غرض سے افیون کا استعمال کرتے کرتے اس کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں۔ کہ بیماری کے دور ہونے پر بھی اس دوا کو چھوڑ نہیں سکتے

ویسے ہی عام طور پر لوگ اپنی طبعی کمزوریوں کو دور کرنے کی غرض سے اختیار کردہ عادات کے ایسے غلام ہو جاتے ہیں۔ کہ غیر ضروری حالات میں بھی ان سے باز نہیں رہ سکتے۔ جیسے اکثر بخیل آدمیوں کی صورت میں نظر آتا ہے کہ باوجود اس امر کو جاننے کے بھی کہ روپیہ صرف ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ روپیہ جمع کرنے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں۔ کہ ضروریات سے لاپرواہ ہونے کا ذکر ہی کیا۔ زندگی کو بھی اس کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ ایسی ہی ہر ایک صورت مثلاً مذہبی و مجلسی رسوم پرستی وغیرہ کا نام کرم بندھ ہے۔ جس سے نجات حاصل کرنا

عادت بننے اور اس سے بچنے کا طریقہ۔ انسان کی طبعی بناوٹ میں چند خاص انسٹنکٹ کام کرتی ہیں۔ جن کے زیر اثر مختلف قسم کے عمل ظہور پاتے ہیں۔ چونکہ ان کے نتائج بصورت کامیابی اور ناکامی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ جنہیں سے اول الذکر صورت میں راحت کا احساس ہوتا ہے اور آخر الذکر حالت میں تکلیف کا۔ اس لئے آئندہ کے لئے وہ طریق عمل اختیار کیا جاتا ہے جس سے راحت ملتی ہے اور وہ طریق عمل مسدود ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ جس عمل کا نتیجہ بار بار راحت بخش ہوتا ہے وہی عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے لہذا عادت کی پابندی سے بچنے کے لئے محض یہی علاج ہے۔ کہ بجائے خیالِ راحت کے خیالِ فرض کام کرنے والا ہو۔ عادت دراصل طبیعت کی خادمہ ہے اور یہ فائدہ بھی بہت پہنچاتی ہے۔ اس لئے بالخصوص بُری عادت سے ہی بچنا مقدم ترین فرض ہونا چاہیئے۔ گو اعلیٰ ترین رہنما کے لئے اچھی اور بُری عادات دونوں یکساں قابل ترک کہی جا سکتی ہیں۔ بمصداق ؎

گر رہبر تست عادتِ خویش — مردود و منافقی نہ درویش

انسان کا فرض اعظم ہے تا کہ وہ عملی زندگی میں صحیح راستہ یعنے دہرم کا مارگ اختیار کرسکے۔ اس لئے بھگوان فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص سچے معنوں میں نجات پانا چاہتا ہے تو اسے یوگ کا اصول عملی زندگی میں اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ ۔ کرم کرت ہووے نیہہ کرم۔ تس ولشنو کا بدل دہرم ۞ چونکہ آگے چل کر یہ بتلایا گیا ہے کہ کرم بندھن کا انحصار انہی اعمال پر ہے جو یگیہ کا مقصد چھوڑ کر یعنے نفس پرستی کے لئے کئے جاتے ہیں۔ اس لئے یوگی کا ہر ایک عمل خاص معنوں میں یگیہ ہی ہوجاتا ہے۔ اب اس کا مہتو بیان کرتے ہیں۔

یوگ کا مہتو

(۴۰) نہ اس کے شروع کرنے میں کچھ نقصان ہوتا ہے ورنہ ہی اختتام تک پہنچنے میں کسی قسم کی تکلیف پیش آتی ہے بلکہ اس دہرم میں تھوڑا سا حصہ لینا بھی انسان کو بڑی سے بڑی مشکلات اور خوفناک حالات سے آسانی گزار دیتا ہے ۞

مطلب یہ کہ عام طور پر لوگ لالچ اور خوف کی وجہ سے جو صحیح راستہ چھوڑ دیتے ہیں یا اپنی سرشٹ کے تمام عناصر پر یکساں توجہ نہ دینے کی وجہ سے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اگر وہ مذکورہ بالا معنوں میں یوگ کے سچے عامل ہو جائیں۔ یعنے نفس پروری کے خیال کو چھوڑ کر کام کریں۔ تو نہ صرف ان کو بیرونی تکالیف کا ہی سامنا نہیں ہوتا۔ بلکہ اطمینان قلبی حاصل ہونے کی وجہ سے اندرونی طور پر بھی عین مسرور رہتے ہیں۔ اب یوگی کی ذہنی کیفیت یعنے یوگ کا تتو بتلاتے ہیں

یوگ کا تتو

(۴۱) ہے ارجن! عام لوگوں میں بیشمار طبعی رجحانات مختلف پہلوؤں میں کام کرتے ہیں۔ لیکن یوگی کی زندگی میں

یکدلی اور یکسوئی کا وصف خاص طور پر پایا جاتا ہے ٭
مطلب یہ کہ آدمی کی ذہنی بناوٹ میں جو بہت سے طبعی رجحانات (انسٹنکٹ)(۱) پائے جاتے ہیں۔ جن کی بدولت وہ خاص حالات میں کام کرودھ لوبھ اور خوف وغیرہ مختلف قسم کے جذبات و خواہشات وغیرہ کا مظہر ہوتا ہے عام طور پر ان کے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے باطنی کشمکش ہر فرد بشر کے انتشار قلبی کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن یوگی کی اندرونی حالت ہم آہنگی کی بدولت پوری شانتی کا جلوہ دکھاتی ہے چونکہ عام طور پر نہ صرف "یوگ" کا تصور ہی کچھ اور کا اور سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ بجائے یوگ کا صحیح راستہ اختیار کرنے کے جہلا میں ویدک ہدایات کی تعمیل (انگیہ کرنے) کو زیادہ وقعت

(۱) انسٹنکٹ کی تعریف پروفیسر ولیم مگڈوگل صاحب نے جنکی رائے میں نفس انسانی مختلف قسم کی انسٹنکٹ کا ہی مجموعہ ہے مندرجہ ذیل صورت میں کی ہے (سوشل سائیکالوجی)

An inherited or innate Psycho-physical disposition which determins its possessors to perciene and to pay attention to objects of a certain class, to experience an emotional excitement of a particular quality upon percieving such an object, and to act in regard to it in a particular manner, or at least to experience an impulse to such action

دی جاتی ہے اور شرتی پرمان یا ایشوری گیان کا اصلی مطلب نہ سمجھکر محض وید کے لفظ پر جاہل لوگ گمراہ کئے جاتے ہیں حالانکہ وید لفظ نہ صرف خاص کتابوں کا ہی نام ہے بلکہ لغوی طور پر گیان کے معنے بھی رکھتا ہے (جیسا کہ پندرھویں ادھیائے کے پہلے شلوک میں کہا گیا ہے)۔ اس لئے کتاب پرستی کے بالمقابل گیان کی عظمت ذہن نشین کرانے اور یوگ کا ادھکاری بتلانے کے خیال سے بھگوان یوں فرماتے ہیں۔

یوگ کا ادھکاری

(۴۲ سے ۴۴) ہے ارجن! جو لوگ خواہشات نفسانی کے پُتلے اور لذات حواس کے شائق یا خیال عزت کے دیوانے ہونے سے سورگ کو ہی معراج اشرف خیال کرتے ہیں نیز جن منتروں کو تتودرشی مہاتما "پشپت واک" کہتے ہیں۔ کیونکہ بھوگ اور ایشوریہ کے طالبوں کے لئے ان میں خاص قسم کے یگیہ وغیرہ بہت سے ایسے اعمال کا ذکر ہے۔ جو کہ جنم اور کرم کا پھل دینے والے ہوتے ہیں ان منتروں کی رنگین بیانی سے جن کی عقل ماری گئی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ بس ان کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ایسے اصحاب ویدوں کی لفظی بحث میں مست رہنے پر بھی بدتمیز ہی ہیں۔ اور اصلی معنوں میں یوگ کے ادھکاری نہیں۔ یعنے سمادھی میں اطمینان قلبی نہیں حاصل کر سکتے

(۴۵) ویدوں کی تعلیم تمام اہل دنیا کے لئے ہے۔ جو کہ تینوں گنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہے ارجن! تو گنا تیت ہو کر دوئی کی قید سے نکل اور ذات حق میں قیام کر۔ نیز خود شناسی کی بدولت تفکرات تحصیل و تحفظ سے آزاد ہو۔

مطلب یہ کہ قدرتی قوانین کے زیر اثر جو حالات پیش آجائیں۔ ان

پر قانع رہ اور رجوگنی یا تموگنی لوگوں کے لئے جو روچک اور بھیانک باتیں کہی گئی ہیں۔ ان کو چھوڑ کر ستوگنی اصحاب کے لئے جو یتھارتھ تعلیم دی گئی ہے۔ اس کو قبول کر۔ گویا سورگ حاصل کرنے کی خواہش اور موجودہ زندگی کے فنا ہونے کا خوف چھوڑ کر آتمک اونتی یعنے سچی شانتی حاصل کرنے کی کوشش کر۔

(۴۶) جس طرح چاروں طرف پانی موجود ہونے پر کنوئیں کے برابر ہی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے ویسے ہی حقیقت دان اصحاب سارے ویدوں میں اپنی ضرورت کے مطابق ہی مطلب رکھتا ہے ؛

مطلب یہ کہ خواہ آدمی سمندر میں سفر کر رہا ہو۔ خواہ گھر میں بیٹھا ہو۔ بہر حال پانی اتنا ہی پیتا ہے جتنا کہ پیاس بجھانے کے لئے کافی ہوتا ہے ویسے ہی ویدوں میں سورگ نرک وغیرہ کی صورت میں خواہ کتنی ہی روچک بھیانک باتیں موجود ہوں۔ تاہم حق شناس ان میں سے صرف انہی کو ڈھونڈتا ہے جو کہ یتھارتھ یعنے اصلی معنوں میں پائی جاتی ہیں۔ گویا ہر شخص کا دھرم جدا جدا ہونے سے اپنی اپنی قابلیت اور استحقاق کے بموجب ہی ان سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اور اگر ویدوں سے مراد علوم سے لی جائے۔ تو بھی ہر قسم کی سائنس سے واقف شخص اپنے کاروبار میں تمام علم کو کام میں نہیں لاتا۔

دوسرا مفہوم اس شلوک کا یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ جس طرح چاروں طرف پانی کی موجودگی میں انسان کو کنوئیں سے کچھ غرض نہیں رہتی۔ ویسے ہی ذات حق کا پورا علم رکھنے والے کو ویدوں کی سند کی کچھ ضرورت نہیں رہتی " کیونکہ برہم کو جاننے سے وہ خود ہی برہم

سوروپ ہو جاتا ہے۔ اور اس کا علم ویدوں کا منبع بن جاتا ہے ۵
برھم گیانی برھم وت تا کی بانی وید ۔ بھاشا انھوا سنسکرت گربت بھید بھرم چھید
گویا کتاب پرستی کی اسی وقت تک ضرورت ہے۔ جب تک اس کا علم
حاصل نہ ہو جائے۔ چونکہ ویدوں کی تعلیم کی غرض و غایت سم درشٹی
اور آتم یاجی بنانا ہی ہے۔ اس لئے "یوگی" یعنی عملی برھم گیانی
کو اس کے سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی مفہوم کو دوسرے
الفاظ میں یوں کہا گیا ہے۔ کہ "یوگ کا جگیاسو بھی شبد برھم سے
آدپر اٹھ جاتا ہے"۔

اب یہ بتلاتے ہیں۔ کہ یوگ درحقیقت تقلید فطرت کا ہی نام ہے
(۲/۴۷) چونکہ تم کرم کرنے پر ہی مختار ہو۔ پھل حاصل کرنے پر نہیں۔ اس
لئے پھل کے خیال کو کرم کا محرک نہ بننے دو۔ اور بیکاری میں تمہاری
دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے ؎

مطلب یہ کہ اول تو کسی کام کا مطلوبہ نتیجہ صرف عامل کی خواہش پر
ہی انحصار نہیں رکھتا۔ بلکہ بیشمار بیرونی طاقتوں کے اثر انداز ہونے سے
اکثر ناکامیابی بھی رونما ہوتی ہے۔ اس لئے کوئی شخص کام تو جیسا
چاہے کر سکتا ہے۔ لیکن مطلوبہ پھل حاصل کرنا اس کے اختیار
میں نہیں کہا جا سکتا۔ دیگر قومی نقطۂ نگاہ سے اعضاء جسمانی
کی مانند جس طرح ایک شخص خود ہر وقت دوسروں کے اعمال
کا فائدہ اٹھاتا ہے ویسے ہی اس کے اعمال کا فائدہ سب کو
پہنچتا ہے۔ ورنہ اگر ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا تمام نتیجہ خود ہی
حاصل کرنے کا مستحق کیا جائے۔ تو جہاں ایک طرف یہ ایک ناممکن

بات کو ممکن قرار دینا ہوگا۔ وہاں دوسری طرف جو طاقتور اور چالاک اشخاص ہونگے
وہ تمام دولت اکٹھی کر لیں گے۔ اور کمزور و جاہل اپنی ضروریات تک پوری کرنے
کے لئے ان کے دست نگر بن جائیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ امیر لوگ تو
عیاشی وغیرہ میں مبتلا ہو کر تباہ جائیں گے اور غریب اپنی ترقی ہی نہیں کر سکینگے
لہٰذا قوم کی قوم ہی تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسی ہی غلطی کا نتیجہ ہے۔ کہ ہندوستان
اگر ترقی نہیں کر سکتا۔ تو مغربی دنیا میں سوشلزم اور بالشوزم رونما ہو رہا
ہے۔ اگر تمام سے کرشن بھگت ؟ بھگوان کے اس مفہوم کو سمجھ لیں۔ تو جہاں
ایک طرف خود اطمینان قلبی سے مسرور ہیں۔ وہاں دوسری طرف ان
کی طاقت کمزوروں کو گرانے کے لئے نہیں۔ بلکہ ان کی امداد و ترقی میں کام آوے
گویا جس طرح کنبے میں ہر شخص اپنی بہترین قابلیت اور دلی کوشش سے
کام کرتا ہے۔ لیکن اس کا تمام فائدہ خود نہیں اٹھاتا۔ بلکہ بچوں اور بوڑھوں
جیسے کمزوروں کو بھی پہنچاتا ہے ویسے ہی سوسائٹی میں انسان کا فرض ہے
کہ وہ اپنے فرض کو پورے طور پر ادا کرنے کا استحقاق رکھے۔ مگر اس کے پھل
کو اپنی شخصیت تک ہی محدود نہ رکھے بلکہ مشترکہ خزانے میں ڈالے
تاکہ طاقتور اصحاب کی طاقت کمزوروں کے لئے مدد کا باعث ہو۔ چونکہ عمل
کو کام میں لانا انسان کا کائنات سے واحد ہونا ثابت کرتا اور وید دن کے
اس اصول کو واضح طور پر ذہن نشین کراتا ہے۔ کہ دان کرنے کا اصلی مطلب
النسبر طہ کہ دیش کال اور پاتر کا خیال رکھنا چاہئے مفروضہ سورگ کا حصول
نہیں۔ بلکہ یہیں پر سورگ راجیہ کا نظارہ پیدا کرنے سے ہے۔ اس لئے اپنے
کرموں کا پھل اپنے لئے ہی چاہنا سراسر جہالت اور غلطی ہے۔ علاوہ ازیں
یہ شلوک قانون کرم کی نسبت اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے بھی

نہائیت غور طلب ہے جو کہ عام لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ہر شخص اپنے اعمال کا ہی نتیجہ پاتا ہے۔ کیونکہ اس عقیدے کا خلاف واقع اور نقصان رساں ہونا اظہر من الشمس ہے چنانچہ خلاف واقع تو اس طرح کہ پیدائش سے لیکر مرنے تک ہر شخص دوسرونکے اعمال اور ایجادات یا تصنیفات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور نقصان رساں اسطرح۔ کہ اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر نہ صرف کسی کو مدد دینے کا خیال ہی نامعقول اور فضول ثابت ہوتا ہے بلکہ اکثر صورتوں میں انسان اپنے لئے بھی تدبیر کرنیکے تقدیر پر ہی شاکر ہونا ضروری سمجھ لیتا ہے ✤

یوگ کی تعریف ۔(۴۸) ہے ارجن! اشخصی تعلق چھوڑ کر اور یوگ میں قیام پذیر ہو کر کرم کر۔ اور کامیابی و ناکامی کو یکساں خیال کر۔ اسی یکسا نیت یعنے سمتا کو یوگ کہتے ہیں ✤

مطلب یہ کہ جہاں کامیابی میں بظاہر کئی قسم کے فوائد پائے جاتے ہیں وہاں اس کے ساتھ ہی بہت سے نقصان بھی چھپے اثر کرتے ہیں اور برخلاف اس کے ناکامی میں اگرچہ بظاہر نقصان ہی نظر آتا ہے۔ لیکن اہل غور کی نگاہ میں کئی قسم کی مخفی برکتیں بھی کام کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے ہر حالت میں روشن اور تاریک پہلوؤں کی یکساں موجودگی دیکھنا ہی اعلےٰ درجے کا کمال انسانی ہے۔ پس یوگی وہی ہے جو کہ کمل کے پتے کی طرح بیرونی حالات سے بے لگاؤ رہے۔ اور سرو آزاد کی طرح سردی گرمی کو یکساں سمجھے ✤

یوگ کا کرم سے اعلےٰ درجہ ہے (۴۹) اعمال کا درجہ بمقابلہ ذہنی ہم آہنگی کے بہت ادنےٰ ہے۔ اس لئے تم باطن کی طرف رجوع کرو۔ پھل کی خواہش رکھنے والوں کی حالت قابل رحم ہوتی ہے ✤

مطلب یہ کہ اول تو کرم کی خوبی محض بیرونی نتیجے پر ہی منحصر نہیں۔ بلکہ

اس کے محرک یعنے کرم کرنے والے کی نیت پر انحصار رکھتی ہے جیسا کہ فلسفہ اتحاد کے دوسرے حصے میں بالتفصیل بیان کیا جا چکا ہے۔ دیگر اگر من کو شانتی حاصل نہ ہو۔ تو بیرونی سامان راحت خواہ کتنے بھی افراط سے کیوں نہ مل جائیں تاہم ان کا ہونا نہ ہونے سے بدتر ہو جاتا ہے۔ جیسے بھوک نہ ہونے کی صورت میں لذیذ کھانے کی حالت ہوتی ہے۔ اس لئے باطنی ہم آہنگی کا خیال رکھنا بمقابلہ دولت دنیا حاصل کرنے کے زیادہ ضروری سمجھنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اطمینان قلبی کی حالت میں جو کام کیا جاتا ہے وہ بلحاظ نتائج کے بھی اس عمل سے اعلےٰ درجہ رکھتا ہے۔ جو کہ خواہشات اور جذبات کے زیر اثر کیا جاوے۔ اس لئے ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر انسان بجائے خیالِ نتائج کی غلامی کے آزادی سے ہی کام کیوں نہ کرے:۔

نجات یافتہ کا وصف

(۵۰) جس شخص کو ذہنی ہم آہنگی حاصل ہو جاتی ہے وہ گناہ و ثواب دونو کے خیال سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اس لئے تو یوگ میں قیام پذیر ہو۔ کیونکہ اسی حالت کا حاصل کرنا عملی پہلو سے دانشمندی ہے:۔

مطلب یہ کہ جس طرح ناٹک میں کوئی شخص راجہ ہو یا بھکاری۔ دونو حالتیں حقیقی نقطہ نگاہ سے بے معنے ہوتی ہیں۔ ویسے ہی جو شخص سم درشی ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے دنیا کی قلعی کھل جانے سے اچھی اور بری دونو قسم کی حالتیں یکساں ہو جاتی ہیں۔ لہذا وہ ان کے حصول کے وسائل کو نیک و بد کی حیثیت سے اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ اطمینان قلبی کو ہی حاصل کرنا تمام اعمال کا جوہر سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح کوئی نعمت دنیا اسے بے نقص نظر نہیں آتی۔ اور کوئی مصیبت بے فائدہ نہیں معلوم ہوتی۔ ویسے ہی کوئی

فعل بھی اسے ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ جسے خیر مجسم یا خالص بدی کہا جا سکے
مصداق خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد۔ ہیں ہوئے وہ صرف اپنے فرض کی
ادائیگی میں ہی محو رہتا ہے خواہ بظاہر اس کا نتیجہ ناپسندیدہ بھی کیوں
نہ ہو۔ بمصداق۔ ع

دغدغہ روز نہ گلچیں کا نہ صیاد کا ڈر ۔ جو گرفتار ہوئے فکروں سے آزاد ہوئے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں ۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

عام طور پر ہر قسم کی تحریک کی ترقی کا مہاپُرشوں کی قربانی پر منحصر ہونا اسی اصول
کا مظہر ہے۔ غرض یہ ہے کہ جہاں ایک طرف یوگی کسی خاص کتاب پر
ایمان لانا سچا دھرم نہیں سمجھتا۔ وہاں دوسری طرف کسی خاص بیرونی
عمل کی پیروی سچے دھرم کا مترادف نہیں خیال کرتا۔ کیونکہ وہی اعمال
جو ایک حالات میں اعلےٰ درجے کے اچھے نتائج پیدا کرتے ہیں۔
دوسرے حالات میں بدترین نتائج کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔ بس
ہر حالت میں وہ مفروضہ نیکی بدی کے خیالات سے بالاتر ہو کر اپنے فرض کا
ہی دامنگیر رہتا ہے۔ جس سے جسم اور دماغ کی طاقتوں کی صحیح نشوونما اور
مہذب شہری کے اوصاف کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی طریق عمل تمام کرموں
میں دانائی کا اظہار کرتا ہے۔ اور اسی سے مکتی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ اگلے
شلوک میں کہا گیا ہے۔

مکتی کا سادھن

(۵۱) ایسا قائم العقل شخص کرم سے حاصل ہونیوالے نتائج کا تعلق چھوڑ کر جنم بندھن سے آزاد ہو کر معراج اشرف کو حاصل کر لیتا ہے۔

اس سے پیشتر شلوک نمبر ۳۹ میں کرم بندھن سے چھوٹنے کا ذکر

کیا گیا ہے۔ اب جنم بندھ سے نجات پانے کا نسخہ بتلایا گیا ہے۔ چونکہ ان دونو قسم کی قیود کا انحصار تاثیر تخم اور اثر صحبت پر ہے۔ جن کو طبیعت اور عادت کی مجبوریوں کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ان سے آزاد ہونا یعنے مکتی پانا درحقیقت اپنے دھرم کرم کے کرنے پر ہی قادر ہونے کا مترادف ہے۔ نہ کہ مرنے کے بعد کسی خاص معروضہ کیفیت حاصل کرنے کا مفہوم۔ جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے نشکام کرم کرنے والوں میں بھگوان نے بدیہ مکت مہاراجہ جنک یا اپنی ذات پاک کی مثال پیش کی ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح زندگی سے مراد صحت جسمانی اور راحت سے مراد صحت نفسانی اور دانائی سے مراد صحت عقلی سے ہے ویسے ہی مکتی سے مراد صحت ارادی سے ہے۔ جس کی بدولت انسان دھرم کا عمل کرنے میں مختار اور آزاد ہوتا ہے لہذا اس کا حصول انسان کے لئے معراج اشرف کہا گیا ہے۔ اب اس یوگ اوستھا کے حاصل کرنے کے وسائل کا ذکر کرتے ہیں۔

یوگ کا دشمن

(۵۲) جب تمہاری عقل تعصب کی آلائش سے پاک ہو جائے گی۔ تب تم سُنی سنائی باتوں پر ایمان لانے سے متنفر ہو جاؤ گے۔ (۵۳) ادھر اُدھر کی سُنی سنائی ہوئی تعلیم سے (خواہ وہ کلام انسانی سے تعلق رکھتی ہو یا الہامی کتب سے) بالاتر ہو کر جب تمہاری عقل مضبوطی سے سمادھی یعنے سم درشتی کی حالت میں قرار پذیر ہو گی۔ تب تم یوگ کے حصول میں کامیاب ہو گے؎

مطلب یہ کہ جس طرح رنگین عینک کسی شے کے اصلی رنگ کے جاننے میں سدّراہ ہوتی ہے۔ اور جیسے چینی عورت کا پاؤں بچپن میں ہی لوہے کا

جوتا پہنایا جانے سے قدرتی نشوونما نہیں پاتا۔ ویسے ہی ہر فرد بشر نہ صرف اعصاب حس و حرکت وغیرہ کے اثر سے ہی حقیقت کائنات کو جاننے سے قاصر رہتا ہے بلکہ شروع سے ہی مذہبی ملکی یا مجلسی و خاندانی تعلیم کے تعصبات کی بدولت صداقت کو اصلی روشنی میں دیکھنے سے محروم رہتا ہے تاوقتیکہ کسی عارف کامل کی ہدایات کے زیر اثر اپنے عقلی نقائص سے آگاہ ہو کر توہمات و تعصبات سے نجات پائے۔ اور ہر ایک دعوے کو تسلیم کرنے سے پہلے اس کے موافق و مخالفین کی دلائل کو بالمقابل ذہن میں جگہ دے سکے۔

بہر حال جب وہ حق پرستی کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ تب جس طرح چاولوں کا طالب دھان کے چھلکے کو پھینک دیتا ہے ویسے ہی وہ ویدوں اور شاستروں پر غور کر کے سم درشن کے اصول کی صورت میں ان کا تتو نکال لیتا ہے۔ بمصداق سے

من ز قرآں مغز را برداشتم ۔ استخواں پیش سگاں انداختم۔

اور کتاب پرستی یا ملت کی پابندی کو ترک کر کے سب کے ساتھ رشتہ وحدت میں مربوط ہو جاتا ہے۔ یہی وہ رتبۂ اعلے ہے جس پر پہنچکر انسان مرد کامل بنتا اور جیون مکت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے:۔ اوم ششم

اصلی معنوں میں شری کرشن بھگوان کا لیکچر جس میں برھم ودیا اور یوگ دونو امور شامل ہیں۔ یہاں تک ختم ہو گیا ہے۔ کیونکہ جتنی دلائل جنگ میں حصہ لینے کے برخلاف ارجن نے پیش کی تھیں۔ ان تمام کا یکے بعد دیگرے معقول اور مکمل جواب دیا جا چکا ہے اب اس کے بعد یا تو ارجن کو اس کے سوال کرنے پر کامل یوگی کی تعریف اور اس کی بول

چال یعنی عملی زندگی کی علامات بتلائی گئی ہیں یا جیسا کہ بعض علما کا خیال ہے
مہابھارت کے مصنف نے خود ہی یا کسی دوسرے معاون نے گیتا کے
مفہوم کو دقیق سمجھکر عوام کے سمجھنے کے لائق بنانے کے خیال سے (جیسا
کہ اس کی بیشمار تفسیریں لکھے جانے سے بھی ثابت ہوتا ہے) اسی دوسرے
ادھیائے کے مضمون پر سوال و جواب کی صورت میں مختلف پہلوؤں سے
مفصل روشنی ڈالی ہے گویا باقی کتاب میں کوئی ایسی نئی بات نہیں پائی
جاتی جس کا بیج اس مضمون میں نہ موجود ہو۔ لہذا نہ صرف اس خیال
سے ہی کہ شریمد بھگوت گیتا کا تتو اس مضمون میں آچکا ہے بلکہ اس
خیال سے بھی کہ کسی کا لیکچر سننے کے بعد تمام سامعین کو ایک ہی قسم
کے سوال نہیں پیدا ہوا کرتے ہم صرف بطور نمونہ کے ارجن کا ایک سوال اور
بھگوان کی طرف سے اس کا جواب ذیل میں درج کرتے ہیں۔ جن اصحاب
کے دل میں کسی پہلو سے کوئی شک وشبہ باقی رہے۔ وہ ہماری اسی سلسلے
کے دو پہلی تصانیف یعنی سم درشن المعروف فلسفہ اعتدال اور
پریم درشن المعروف فلسفہ اتحاد کے مطالعہ سے اطمینان خاطر حاصل
کر سکتے ہیں یا کرشن بھگتی کا تتو نامی چھوٹا سا ٹریکٹ پڑھ کر صحیح روشنی
حاصل کر سکتے ہیں ورنہ گیتا کی دیگر تفسیریں تو بذات خود بصورت فرقہ
بندیوں کے اسی الجھن میں پھنسانے کا موجب ہو رہی ہیں۔ جس سے نجات
دلانے کے لئے اس کی تصنیف ہوئی تھی۔ بہر حال مذکورہ بالا لیکچر سنکر ارجن
نے پوچھا۔

(٥٤) ہے بھگون! جس شخص کی عقل سمادھی میں قائم ہو چکی ہے۔ اس کی
تعریف کن الفاظ میں کی جا سکتی ہے؟ اور ایسے ساکن العقل شخص کی

گفتار اطوار اور رفتار کیسی ہوتی ہے؟ بھگوان نے فرمایا۔

بلحاظ خواہشات

(۵۵) ہے ارجن! جب انسان تمام خواہشات[علت] نفسانی کو ترک کرکے اپنی روحانی ہم آہنگی (صحت چہارگانہ) پر ہی قانع رہتا ہے۔ تب مستقل عقل والا کہا جاتا ہے

بلحاظ جذبات

(۵۶) جس کا دل دکھ میں بیقرار نہ ہو۔ اور سکھ میں پابند نہ ہو۔ نیز جو رغبت خوف اور غصے کو دور کر چکا ہو۔ وہی قائم العقل مہاتما کہا جاتا ہے۔

بلحاظ خیالات

(۵۷) جو کسی حالت سے بھی دلچسپی نہیں رکھتا اور تعریف ومذمت سننے یا اچھے بُرے حالات پیش آنے پر نہ خوشی مناتا ہے۔ نہ اظہار نفرت کرتا ہے۔ اس کی عقل برقرار کہی جاتی ہے۔

بلحاظ اعمال

(۵۸) کچھوے کے اعضا سکڑنے کی طرح جب کوئی شخص ہر قسم کی لذات سے اپنے حواس کو اندر کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ (یعنی قوت ارادی طاقت پکڑ لیتی ہے) تب اس کی عقل کامل کہی جا سکتی ہے

یوگ کا راز

(۵۹) اگر حواس کو محسوسات سے علیحدہ رکھا جائے تو لذات نفسانی سے تو انسان بچا رہتا ہے لیکن ان کی خواہش سے نہیں بچتا۔ مگر انکشاف حقیقت ہونے پر کسی بات کی بھوک ہی نہیں رہتی۔

علت محفی نہ رہے۔ کہ یہاں ضروریات زندگی کو پورا کرنا ممنوع نہیں کہا گیا۔ بلکہ خواہشات نفسانی کا ذکر ہے۔ فرق ان دونوں میں یہ ہے۔ کہ خواہشات جزوی وعارضی راحت کا موجب ہوتی ہیں۔ مگر ضروریات کا تعلق آتمک اُنتی سے ہوتا ہے۔

مطلب یہ کہ جس طرح بچے سے کھلونے چھین لینے پر اس کے دل سے ان کی خواہش نہیں مٹتی۔ ویسے ہی اگر کوئی شخص ہٹھ کر کے لذات حواس سے باز رہے۔ یعنے گھر بار چھوڑ کر مجردانہ ریاضت کی زندگی اختیار کرے یا سورداس جی کی طرح حواس کو کمزور کر دے تو اُس کے یہ معنے نہیں کہ اس کا دل بھی ادھر جھکاؤ نہیں رکھتا۔ بلکہ جس طرح شادی ہونے پر جوان لڑکی کو گڑیا کی کھیل میں دلچسپی نہیں رہتی۔ ویسے ہی چشم بصیرت کھلنے یعنے ہر شے کے روشن و تاریک پہلوؤں سے واقف ہونے یا حقیقت دنیا کا آخری راز سمجھ میں آنے پر اہل عقل نفس پرستی کے جال سے بالاتر ہو جاتا ہے +

ضبط حواس کی ضرورت (٦٠) ہے ارجن! بے قابو حواس عقلمند آدمی کے دل کو بھی باوجود اس کی مخالفانہ کوشش کے زبردستی کھینچ لے جاتے ہیں (٦١) اس لئے ان سب کو بس میں لاکر اعتدال پرست بن اور مجھے اپنا اشٹ دیو سمجھ۔ یعنے میرے اصول کو اختیار کر۔ جس کے حواس مطیع ہو جاتے ہیں۔ اسی کی عقل مکمل کہی جا سکتی ہے۔

مطلب یہ کہ جس طرح رتھ کے گھوڑوں کو لگام اور چابک کی بدولت اپنے حسب منشا چلایا جاتا ہے۔ ویسے ہی ابھیاس اور ویراگ کے سادھنوں سے کام لیتے ہوئے اپنے حواس کو ضبط میں لانا موجب کامیابی ہوتا ہے ؛

ضبط خیال کی ضرورت (٦٢-٦٣) لذات کا دھیان کرنے سے ان میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس دلچسپی سے ان کی خواہش کا ظہور ہوتا ہے اور خواہش سے غصہ نمودار ہوتا ہے۔ غصہ طبیعت

کو پریشان کرتا ہے اور پریشانیٔ طبع سے قوت یادداشت زائل ہو جاتی ہے۔ اور حافظے کی خرابی عقل کو تباہ کر دیتی ہے اور اس سے انسان مارا جاتا ہے۔ مطلب مختصر یہ کہ لذات حواس کا خیال کرنا ہی انسان کو خراب کرتا ہے اس لئے اس سے بچنا چاہیئے۔ اور ہر وقت اعلےٰ علمی اصولوں کے سمجھنے میں مصروف رہنا چاہیئے۔

(٦٤) جس شخص نے اپنے من کو قابو کر رکھا ہے۔ وہ رغبت و نفرت سے بالاتر رہتے ہوئے اپنے مطیع کردہ حواس سے لذات اٹھاتا ہوا بھی اطمینان خاطر سے مسرور رہتا ہے۔ (٦٥) اس سرور کی بدولت اس کی تمام تکالیف دور رہتی ہیں اور دل کے خوش رہنے سے بہت جلد عقلی کمال حاصل ہو جاتا ہے۔ (٦٦) بداعمال شخص کو نہ ہی خیالات کی پاکیزگی میسر آتی ہے۔ اور جب دل صاف نہ ہو۔ تو اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ اور جسے سکون خاطر نہیں۔ اسے سکھ کہاں؟

ضبط حواس کا نتیجہ [illegible]

(٦٧) حواس کے کاروبار میں مصروف ہو کر من جس کسی کے پیچھے بھی چلا جاتا ہے۔ وہی اسکی عقل کو خراب کر دیتی ہے۔ جیسے ہوا کا زور پانی میں کشتی کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے

(٦٨) اس لئے ہے ارجن! جس کے حواس ہر قسم کی لذات نفسانی سے رکے رہیں اسی کی عقل اعلےٰ درجہ رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح کوچوان وہی ہوشیار کہا جاتا ہے۔ جو کہ زبردست گھوڑوں کو بھی راہ راست پر چلائے ویسے ہی عقل بھی وہی افضل کہی جا سکتی ہے۔ جو کہ من اور اندریوں کو قابو میں رکھ کر ان سے صحیح کام لے ۔

اہل کمال کے اوصاف۔ (٦٩) جو عام لوگوں کی رات ہے اسمیں

ضابط شخص بیدار رہتا ہے اور جس حالت میں عام لوگ جاگتے ہیں اس کو اہل کمال رات سمجھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ دُنیا کو گمراہ اور غفلت میں مبتلا دیکھتے ہوتے وہ ایسی چال چلتا ہے جو کہ عام کو اُلٹی معلوم ہوتی ہے جیسے سقراط مسیح برونو اور گلیلیو کے سزا پانے اور گورونانک کو "کوراہی" وغیرہ کا خطاب دیئے جانے سے ثابت ہوتا ہے۔

یوگی کی طرز زندگی

(۱) فردی حیثیت میں

(۷۰) جس طرح لبالب بھرے ہوئے اور اپنی حدود سے متجاوز نہ ہونے والے سمندر میں دریا آملتے ہیں۔ ویسے ہی تمام خواہشات نفسانی جبکو خودبخود حاصل ہوتی ہیں اسی کو اطمینان خاطر نصیب ہوتا ہے نہ کہ لذات کے پیچھے دوڑنے والے کو۔ مطلب یہ کہ یوگی ایسا مستغنی المزاج ہوتا ہے۔ کہ ضروریات زندگی پورا کرنے میں اس کو خودبخود جو لذات حاصل ہو جاتی ہے وہ انہی پر قناعت کرتا ہے ان کے پیچھے دیوانہ وار دوڑا نہیں پھرتا۔ جیسا کہ عام لوگوں کی حالت پائی جاتی ہے۔

(۲) قومی حیثیت میں

(۷۱) جو شخص تمام لذات نفسانی کا خیال چھوڑ کر بے تعلقی سے اپنا فرض ادا کرتا ہے اور خودی و تعصب سے پاک رہتا ہے وہ سچی شانتی کو حاصل کرتا ہے۔ مطلب مختصر یہ کہ خود غرضی کو چھوڑ کر عوام کی بہتری کے لئے کام کرنا ہی یوگی کا خاصہ ہے وہ "میں میرے" کی قیود سے بالا تر ہونے سے نہ راحت کا طالب ہوتا اور نہ ہی تکلیف سے ڈرتا ہے۔ لیکن یہ خیال رکھنا ہے۔ کہ سکھ اور دُکھ محسوس کرنا بُرا نہیں۔ بلکہ رغبت و نفرت کی صورت میں ان سے

دل لگانا غلطی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ویسے ہی اوصاف اشیاء کا علم دینے والے ہونے چاہئیں جیسے آنکھ یا جلد وغیرہ سے خاص اوصاف اشیاء کا محسوس کرنا۔ نہ کہ ہم ان سے دل لگا بیٹھیں۔ جو کہ ہماری گمراہی اور تباہی کا باعث ہو جیسے جج کا مدعی یا مدعاعلیہ سے تعلق رکھنا صحیح فیصلے میں سدراہ ہو جاتا ہے: چنانچہ ایسے ہی دوسرے شاستروں میں بھی من کو ہی بندھ اور موکش کا باعث بیان کیا گیا ہے۔ اس لیئے دل کی صفائی کو وہ اپنا جوہر ذاتی سمجھتا۔ اور اسی کیفیت قلبی کا لازوال لطف اٹھاتا ہے: بہرحال یہاں تک بھگوان نے ارجن کے استفسار کا جواب دیا۔ اب آخری شلوک میں " یوگی " کی حالت کا منتہٰ ظاہر فرماتے ہیں۔

وصال حق ۔ (۷۲) ہے ارجن! اسی حالت کو برہم میں قیام پذیر ہونا کہتے ہیں۔ جس کے حاصل کرنے پر انسان توہمات میں گرفتار نہیں ہوتا۔ آخری وقت میں بھی اسمیں قرار پانے پر وصال حق کا لطف مل جاتا ہے:

مطلب یہ کہ " صبح کا بھولا شام کو بھی گھر آ جائے۔ تو اس کو بھولا نہیں کہتے "۔ لہٰذا اگر کوئی شخص خود پرستی کا دیوانہ ہونے سے لذات حواس کی تلاش میں عمر بھر مصروف رہا ہو۔ تو بھی اسے مایوس نہیں ہونا چاہئیے بلکہ آخری وقت تک حصول نجات کی کوشش کرنا بہتر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ " جب تک سانس .... تب تک آس "۔ یعنے جب تک مریض کا سانس چلتا ہے۔ تب تک ڈاکٹر لوگ کوئی نہ کوئی دوائی دئیے ہی جاتے ہیں۔ کہ شائد اب بھی مرض دور ہو جائے۔ ویسے ہی آخری وقت تک انسان کا فرض ہے۔ کہ وہ معراج اشرف کے حصول کے لئے کوشش کرتا رہے

اور مایوس الطبع اشخاص کی طرح یہ نہ خیال کرے ۔ ؎

عمر ساری تو کٹی عشق بُتاں میں مومن ۔ آخری وقت میں اب خاک مسلماں ہونگے

بلکہ برخلاف اس کے خدا کی رحمت سے کبھی بے امید نہ ہو۔ کیونکہ بمصداق

؎ اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار ۔ نہ ہو اُس سے مایوس امیدوار

اکثر مشاہدے میں آتا ہے۔ کہ جن مشکلات کے دور کرنے سے بڑے بڑے زبردست عالم عاجز ہوتے ہیں۔ وہ بوجوہات خاص چشم زدن میں کافور ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے بھگوان نے فرمایا ہے۔ کہ اگر آخری وقت بھی اس "یوگ" ودیا کا کوئی سہارا حاصل کرلے۔ تو حیات ابدی اور راحت دوام اسی کا حصّہ ہے ۔ ؎

ایں درگہ مادرگہ ناامیدی نیست ۔ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ۔

(اوم شم)

حصّہ دوم

امرت ساگر

ہندو دہرم کا سچا تتو سمجھانے اور ملت پرستی کی مرض کو دور کر کے سچے سنگٹھن کا سبق پڑھانے والا۔ ویدک علم ادب کا بہترین پھل شریمد بھگوت گیتا نامی وہ پرم دہرم شاستر ہے۔ جسمیں بحیثیت مجموعی بندھ اور موکش کی حقیقت دکھلانے اور ان کے قدرتی اسباب یعنی دیوا سر پرکرتی کی ماہیت بتلانے کے ساتھ ہی دہرم کرم بھگتی گیان۔ یوگ یگیہ۔ تپ دان اور سنیاس وتیاگ وغیرہ اصطلاحی الفاظ کی ایسی معقول تشریح کی گئی ہے۔ گویا سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ نیز سم درشن کی بنیاد پر تمام مذہبی خیالات کو ایک ایسے اصول وحدت سے وابستہ کر کے ذہن نشین کرانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ گویا بے بہا موتیوں کی ایک مالا پرو کر رکھ دی ہے۔ جس کو پہننے والا تتو درشی بن جاتا ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح دیوتاؤں اور اسروں نے مل کر سمندر سے چودہ رتن نکالے تھے ویسے ہی اس امرت ساگر میں چودہ ودیا کا تتو اس عمدگی سے جمع کیا گیا ہے کہ اس کو حاصل کرنے پر اسر بھی دیوتا ہو جاتے ہیں بالفاظ دیگر مادہ پرست بھی حق پرست بن جاتے ہیں۔

لیکن چونکہ بچپن کی سُنی سُنائی باتوں پرست ہونے اور شاستروں کی لفظی بحث میں دلچسپی رکھنے والے اصحاب فطرتی غرور و تعصب کے زیر اثر صورتوں میں مبتلا، غلط فہمی ہو کر نہ صرف ارجن کی طرح دہرم کو ادہرم اور ادہرم

کو دہرم سمجھتے ہوئے خود ہی راہ راست چھوڑ بیٹھتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنے لواحقین اور متعلقین کو بھی گمراہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گیتا کی لاثانی روشنی میں ان اصطلاحات کی قدرے توضیح کر دی جائے۔ چنانچہ اس خیال سے پہلے دہرم (دین مختفی) اور پرم دہرم (دین الہیٰ) کا ہی فرق واضح کیا جاتا ہے۔

دہرم شاستر اور پرم دہرم شاستر

میچنکاف وغیرہ مغربی سائینسدانوں نے انسانی فطرت کی بے آہنگیوں کو مفصل طور پر بیان کیا ہی ہے لیکن ان سے پیشتر مشرقی علما بھی اس حقیقت سے بیخبر نہیں تھے۔ چنانچہ مرزا غالب کا کلام ہے:-

ع مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولے برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

ایسے ہی ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں۔ ع

فطرت سے ہی بشر کو ہے رغبت خلاف سے۔ پیتا تھا خون شکم میں ماں کا یہ ناف سے

لہٰذا اگرچہ سرشت انسانی کے فطرتی نقائص یا اکثر رحجانات طبعی کے باہمد گر متضاد ہونے کی بدولت نوع انسان کی جماعت بندی کے خیال سے کسی نہ کسی قسم کے رشتۂ وحدت کو ضروری سمجھتے ہوئے تقریباً ہر ایک عالم وقت نے کسی خاص کتاب کو سند حقیقی بنانے پر خاص زور دیا ہے۔ اور بغرض مصلحت یا سریع الاعتقادی کے باعث اس کتاب کے مصنف کو خدا کا بیٹا یا رسول یا بھگت یا اس کا اپنا ظہور ہی تسلیم کرنا اور کرانا ضروری خیال کیا ہے۔ لیکن، عام طور پر جہاں ایک طرف ایسی کتب محض ایمان لانے کا ذریعہ بن کر اشتراک عقائد کی وجہ سے لاکھوں یا کروڑوں افراد کو ایک رشتۂ اخوت

میں پرونے اور باہمی محبت بڑھانے کا باعث ہوئی ہیں وہاں دوسری طرف ملکی و مجلسی تفرقات یا عقلی و اخلاقی اختلافات کے باعث جن اقوام کو وہ اپنے حلقۂ اثر میں نہ لا سکیں ان کو غیر اور علیحدہ یا باغی سمجھ کر مخالفانہ روش اختیار کرانے اور باہمی جنگ و جدل کا باعث بننے کی صورت میں خطرناک بھی اتنی ثابت ہوئی ہیں۔ کہ موجودہ تہذیب اور روشنی کے زمانے میں کثیر التعداد علما ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو کہ فرقہ بندی اور ملت پرستی کو مصائب دنیا میں سب سے بدتر سمجھتے ہوئے کسی خاص کتاب پر ایمان لانا محض توہم پرستی اور زمانہ وحشت کی یادگار خیال کرتے ہیں اور اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اگر کوئی کتاب واقعی ایمان لانے کے قابل ہو سکتی ہے تو صرف وہی جو کہ مذہبی رواداری کی تعلیم دینے اور معقولیت پر مبنی ہونے کے علاوہ مساوات انسانی کو اعلےٰ ترین اخلاقی کسوٹی قرار دے۔ گویا دوسرے الفاظ میں وہ دہرم سناتن نہیں ہونا چاہیئے (جو کہ حالات مکانی و زمانی کے اختلافات کے ساتھ تبدیل ہوتا رہے) بلکہ پرم دہرم سناتن ہونا چاہیئے۔ جس میں تمام مذہبی ہدایات کے بنیادی اصول کو اس طرح پر پیش کیا گیا ہو۔ کہ ہر شخص اپنے اپنے فرائض کی صحت کو آزادانہ عقل سے اس کی روشنی میں صحیح طور پر دیکھ سکے۔

چونکہ جس طرح عملی طور پر سوائے ہندو دہرم کے دیگر جماعتوں میں مذہبی رواداری ایک معنوں میں مفقود نظر آتی ہے۔ ویسے ہی علمی طور پر بھی سوائے ان کے کوئی مذہبی جماعت اس دعوے کو پیش کرنے سے گھبراتی ہے۔ کہ وہ اپنی کتاب مقدس کو عالمگیر اصولوں یا عقلی دلائل سے وزن کرنے کی اجازت دے۔ بلکہ بمصداق ع" ہر کہ شک آرد کافر گردد"، جس کو لینے

مسلمہ دعووں پر اعتراض اُٹھاتے دیکھتی ہے اسی کو دہریہ یا کافر وغیرہ کے خطابات سے موسوم کرتی اور بشرط امکان سنگساری وغیرہ کی صورت میں سزا دینے کے لئے تیار پائی جاتی ہے گویا ہندو فرقوں میں ہی کسی حد تک آزاد خیالی ایک نمایاں وصف کی حیثیت میں جلوہ دکھاتی اور دہرم کی نسبت پرم دہرم کو قابل قدر بتلاتی ہے۔ جیسا کہ آریہ سماج کے اس نیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ وید کا پڑھنا پڑھانا اور سننا سنانا ہر شخص کا "پرم دہرم" ہے۔ لیکن درحقیقت جن معنوں میں یہاں لفظ پرم دہرم کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان معنوں میں تقریباً تمام دیگر مذاہب کے علما بھی اپنی اپنی مقدس کتب کا مطالعہ اور اس کی تبلیغ کو فرض اعظم خیال کرتے نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ بحالات موجودہ انجیل کی اشاعت کا تو (بقول اہل بندے ماترم) یہ عالم کہا جاتا ہے۔ کہ ہر تین سیکنڈ میں اس کی ایک کاپی شائع ہوتی ہے۔ اور ایسی ایسی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ جن کا کوئی مقررہ رسم الخط بھی نہیں پایا جاتا۔ لہذا یہ تو صرف تعصب کا ہی نتیجہ کہا جاسکتا ہے کہ کتابی معنوں میں وید کو یہ درجہ دیا جاوے۔ ہاں البتہ اگر وید سے مراد گیان سے لی جاوے جیسا کہ گیتا (ادھیائے ۱۵ اشلوک اول) میں کہا گیا ہے تو اس اصول پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مطلب مختصر یہ ہے۔ کہ پرم دہرم شاستر یعنی دین الٰہی درحقیقت وہ کہا جا سکتا ہے۔ جو کہ تمام مذاہب سے تعلق رکھتے ہوئے کسی کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ رکھے۔ بلکہ کمل کے پتے کی طرح بے لوث رہے۔ گویا نہ صرف دھارمک تتو پر بحث کرتے ہوئے تمام مذہبی ہدایات کی توضیح کرنے والا ہی ہو۔ بلکہ قیود مکانی و زمانی سے بالاتر یعنی عالمگیر حیثیت بھی رکھتا ہو۔ چنانچہ اس پہلو

سے اگر کوئی نسخہ پرم دہرم شاستر کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ تو وہ محض شریمد بھگوت گیتا ہی ہے۔ جسکی تعلیم کا نتیجہ ہندو دہرم کی موجودہ مذہبی رواداری کی صورت میں اظہر من الشمس بھی ہے +

ممکن ہے۔ گیتا کو دہرم شاستر ماننے والے یہ دلائل پیش کریں۔ کہ (۱) اول تو اس کا آغاز ہی لفظ دہرم (دہرم کشیتر) سے ہوتا ہے (۲) دیگر خود بھگوان کرشن نے بھی اس کے آخری ادھیائے کے آخری حصے (شلوک ۷۰) میں اس کو "دہرم سمواد" کے نام سے موسوم فرمایا ہے (۳) سوم اس میں دہرم کے پالن کرنے پر اتنا زور دیا گیا ہے۔ کہ دہرم کا بالکل نظر انداز کرنا تو درکنار اپنا دہرم ادا کرتے ہوئے بصورت عدم تکمیل مرجانا بہتر کہا گیا ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ کسی دوسرے کا دہرم عمدگی سے کرتے ہوئے کامیابی حاصل کی جائے۔ (۴) بھگوان کے اوتار دھارن کرنے کی اصلی غرض بھی یہی بتلائی گئی ہے۔ کہ دہرم کی بنیاد مضبوط کی جائے۔ اس لئے ان کی تعلیم دہرم اوپدیش ہی کہی جا سکتی ہے (۵) نہ صرف ستوگنی اوصاف یا دیوی سمپتی کی عظمت و تفصیل کی موجودگی ہی اس کو دہرم کی ہدایات کا خزانہ ثابت کرتی ہے۔ بلکہ شریہ مارگ کی رہنمائی کرنا اور دیگر دھارمک گرنتھوں کے حوالے دینا یا اپنے دہرم پر اٹل ہونے کی مثال پیش کرنا بھی اسی امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ گیتا ایک دھرم شاستر ہی ہے۔

لیکن ان کے جواب میں یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ گیتا کو دہرم کا گرنتھ ماننے میں تو کسی کو بھی کلام نہیں۔ ہم تو اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہ دیگر مذہبی کتابوں کی طرح یہ کسی خاص دہرم کی صورت نہیں۔ بلکہ ایک ایسی

حقیقت کا اظہار کرتی ہے ۔ جو کہ سب کے اندر یکساں جلوہ نما ہوتے ہوئے بھی ان سب سے علیٰحدہ رہتی ہے ۔ بالفاظ دیگر دوسرے مذاہب کو اگر اجسام قرار دیا جائے تو گیتا کی تعلیم ان میں بمنزلہ روح کے خاص حیثیت رکھتی ہے اسی لئے اس کو ان سے افضل یعنی پرم دھرم شاستر کہا گیا ہے ۔ چنانچہ جہاں ایک طرف اس میں اہنسا ستیہ اور شم دم وغیرہ تمام دھارمک ہدایات کا بالتفصیل ذکر کرنے کے ساتھ ہی تمام مذاہب منزل حقیقی کے ہی متعلق راستے بیان کئے گئے ہیں ۔ وہاں دوسری طرف نہ صرف اس امر کی معقول توضیح ہی کی گئی ہے ۔ کہ دھرم کرم کی حقیقی کسوٹی کیا ہے ؟ یا کسی خاص عمل کو کس اصول پر کرنا چاہیئے ؟ بلکہ واضح الفاظ میں تمام دھرموں سے بے تعلق رہ کر ایک اصول حق کو ہی اختیار کرنے پر بھی خاص زور دیا گیا ہے ۔ جسکی علمی تشریح اگر ہم اپنی تصنیف فلسفہ اعتدال حصہ سوم میں عقل سلیم کے عنوان سے اور فلسفہ اتحاد حصہ دوم میں کرم یوگ کے نام سے مفصل طور پر کر چکے ہیں ۔ تو عملی پہلو سے "کرشن بھگتی کا تتو" نامی رسالے میں بھگوان کرشن کی عظمت کا راز دکھانے کی غرض سے دھرم کے دو بنیادی اصول بھی پیش کئے جا چکے ہیں ۔ لہذا شائقین ان کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔

بہر حال مطلب مختصر یہ ہے کہ گیتا ہی ایک ایسی کتاب ہے جس پر نہ صرف تمام اہل ہنود بلکہ مختلف مذہبی جماعتوں کے مجموعے یعنی تمام قوم کی نگاہ مرکوز کی جا سکتی ہے یہی وہ پرم دھرم شاستر ہے ۔ جو کہ عالمگیر اصولوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے سنگھٹن کے لئے نسخۂ اکسیر کا کام دے سکتا ہے ۔ کیونکہ دھارمک عظمت کے تمام اصول اسی گرنتھ میں موجود پائے

جاتے ہیں۔ جیساکہ "ارتقا، مذہب اور مذہب ارتقا" نامی کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے۔ چنانچہ کتاب مذکورہ کا مصنف لکھتا ہے۔ کہ مختلف مذاہب کی عظمت مندرجہ ذیل سات اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے

(۱) اس میں اخلاقی ذمہ واری کہاں تک کام کرتی ہے۔ اور دوسروں کی سند (authority) کہاں تک؟

(۲) اس کی ضرورت بیرونی نقطہ نگاہ سے کتنی ہے اور اندرونی نقطہ نگاہ سے کتنی؟

(۳) اس کا انحصار معراج (آدرش) پر کہاں تک ہے اور خوف پر کہاں تک؟

(۴) اسمیں ذاتی اغراض کہاں تک کام کرتی ہیں اور بےغرضی کہاں تک؟ مثال کے طور پر اگر اسمیں سے دائمی زندگی اور بہشت وغیرہ کے تصورات علیحدہ کر دیے جائیں تو یہ اپنی ہستی قائم رکھ سکتا ہے یا نہیں؟

(۵) ان کا انحصار Traditions (روایات) پر کہاں تک اور Visions واقعات پر کہاں تک؟

(۶) اس میں سکون کہاں تک ہے اور تبدیلی یا ترقی کہاں تک؟

(۷) ماضی میں اس نے کہاں تک اپنا معراج حاصل کیا ہے اور کتنا ناکامیاب رہا ہے؟

لہٰذا ان تمام امور کو ہر پہلو سے بصورت اعتدال بھگوت گیتا کی تعلیم میں پورے طور پر موجود دیکھتے ہوئے بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جو رتبہ علم نجوم میں کوپرنکس اور گلیلیو کا ہے یا علم الزندگی میں ڈارون اور ہکسلے کا یا علم الذہن میں فرائڈ اور ژنگ کا کہا جاتا ہے وہی علم المذاہب میں بھگوان کرشن اور وید ویاس کا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ بہت سے اہل مذہب

ایسے ہیں - جو کہ باوجود علمی ترقی کو تسلیم کرنے کے اس بوڑھیا کی طرح جس نے ڈارون کی تھیوری کے مطالعہ کرنے پر کہا تھا - کہ "کیا ہم بندروں کی اولاد ہیں ؟ اول تو یہ جھوٹ ہے - لیکن اگر سچ بھی ہے تو دعا کرو - کہ یہ عام طور پر ظاہر نہ ہو جائے" یا تو سچائی سے انکار کر دیتے ہیں اور اگر بالفرض انکار نہیں کر سکتے - تو آنکھ بند کر کے اس کو مخفی رکھنے کے لئے ضرور کوشش کرتے ہیں - لیکن کبوتر کی مانند اس طرح بلی سے بچنا محال ہے - ضرورت ہے کہ آنکھیں کھول کر اپنے مذہب کی ہسٹری کا مطالعہ کیا جاوے - صرف اسی طریق پر موجودہ حالت سے بہترین حالت حاصل کرنے کا اصول سمجھ میں آ سکتا ہے - مختلف زمانوں میں ظاہر شدہ مذاہب کا مقابلہ آج کے اصولوں پر نہیں کیا جا سکتا - کیونکہ جو آج ظاہر ہوا ہے وہ اپنے پہلوں سے پیچھا نا جائے گا - گویا ایک کی جڑوں کا دوسرے کے پھلوں سے مقابلہ کرنا سراسر غلطی ہے - لہذا گیتا کی عظمت حقیقی کو تسلیم کرتے ہوئے اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں - کہ دھرم وغیرہ الفاظ کا مفہوم عام طور پر کیا سمجھا جا رہا ہے ؟ اور گیتا کے نقطۂ نگاہ سے کیا سمجھنا چاہیئے ؟

دھرم کا تتو

اگرچہ اس امر میں کسی کو کلام نہیں - کہ مکتی (جسمیں روحانی شانتی اور عملی آزادی ہر دو امور شامل ہیں) کا لاثانی سادھن صرف دھرم ہی ہے اسی لئے چاروں پرشارتھ بیان کرنے میں دھرم کو ارتھ اور کام سے پہلے اور موکش کو آخر میں جگہ دی گئی ہے - لہذا جو شخص اس کی پابندی سے لاپرواہ ہو جاتا ہے وہ درحقیقت بجائے آزادی کے بدلگامی کا شکار بن جاتا ہے اور اس کی روک تھام کیلئے مجلسی یا ملکی قوانین سے کام لینا ایک لازمی نتیجہ ہوتا ہے - لیکن چونکہ

دہرم کی نسبت مختلف مذہبی جماعتوں کے مختلف خیالات پائے جاتے ہیں
مثال کے طور پر اہل ہنود میں ذات پات کی خاص رسوم پر زور دینا چھوت
چھات کا خاص خیال رکھنا۔ کھانے پینے میں خاص اشیاء کی ممانعت
اور شادی غمی وغیرہ مجلسی رواج کی پیروی حتے کہ بعض صورتوں میں
دس برس سے کم عمر کی لڑکی کا بیاہ کرنا بھی دہرم کا ایک ضروری انگ خیال
کیا جاتا ہے ایسے ہی خاص عقائد کا پرچار کرنا یا مزار پرستی وغیرہ توہمات
میں حصہ لینا دہرم کے لوازمات سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت ان
باتوں کا جیسا کہ فلسفہ اتحاد کے دوسرے حصے میں فلسفہ مذہب کے
عنوان سے بالوضاحت بیان کیا جاچکا ہے۔ دہرم سے مترادف قرار دینا
انتہائی درجے کی غلط فہمی بلکہ حماقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ مہرشی کناد
کے الفاظ میں دہرم وہ ہے جس سے دین و دنیا میں کامیابی حاصل ہو۔
اس لئے اصلی معنوں میں دہرم سماج دھارنا کے مفہوم کو مدنظر رکھتے
ہوئے جسمانی ذہنی اور اخلاقی قوا کی نشوونما اور قومی بہبودی کے
لئے اپنی قابلیت کے بموجب پورا حصہ لینا ہی دہرم کہا جاسکتا ہے
نہ کہ فردی مصائب اور مجموعی تباہی کے کام کرنا۔ چنانچہ یہی امور ہیں
جن پر بھگوت گیتا میں لفظ یوگ اور لوک سنگرہ کے نام سے خاص
توجہ دلائی گئی ہے۔ اور چاروں ورنوں کے اعمال کو جو کہ گن کرم پر
انحصار رکھتے ہیں۔ یعنے فطرتی قابلیت اور اپنی کوششوں کا نتیجہ
ہوتے ہیں راگ دویش کا خیال چھوڑ کر (جو کہ فردی زندگی اور راحت سے
خاص تعلق رکھتے ہیں) فرائض منصبی سمجھنا ایشور پراپتی یا پرم گتی کا
بہترین وسیلہ کہا گیا ہے۔

چونکہ یوگ کا مفہوم فلسفہ اعتدال اور فلسفہ اتحاد میں بالتفصیل بیان کیا جا چکا ہے اس لئے بخوف طوالت یہاں پر صرف اشارہ کرنا ہی کافی سمجھا گیا ہے لیکن دہرم کی حقیقت پر جو غلط فہمی کا پردہ پڑا ہوا ہے اس کو اٹھانے کی غرض سے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چوراسی لاکھ حیوانی اجسام میں سے گزر کر انسان کی صورت حاصل کرنے کی وجہ سے سرشت انسانی میں بیشمار متضاد رجحانات طبعی (جنہیں خود پرستی قبیلہ پروری اور قوم پرستی وغیرہ کی انسٹنکٹ شامل ہیں) یا نفسانی خواہشات کی بے آہنگیوں (Disharmonies) کی بدولت اس کی زندگی لگاتار جدوجہد کا ہی دوسرا نام ہے (جسکو شاستروں کی اصطلاح میں دیواسر سنگرام کہا جاتا ہے) اور اسمیں کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ کہ بھگوان کرشن کی طرح کسی قسم کے ہتھیار کو ہاتھ میں نہ لیتے ہوئے اپنے جسم روپی رتھ کے حواس بدلی گھوڑوں کو من کی لگام کے ذریعہ ساتمیہ اور ستھر بدھی کی ہدایت کے بموجب صحیح راستے (شریہ مارگ) پر چلائے۔ گویا ہر ایک پہلو سے ضبط نفسانی اور عقلی ترقی کی کوشش کرتا ہوا زندگی بسر کرے ممکن ہے۔ کوئی صاحب یہ اعتراض کرے کہ وہ دہرم آزادی کا ساد ھن کیسے کہا جا سکتا ہے۔ جوکہ بذات خود خاص قسم کی پابندی کا تقاضا کرتا ہو۔ بمصداق ؎

درد سر کیواسطے پینے میں تو مفید صندل۔ اس کا گھسنا اور لگانا درد سر یہ بھی تو ہے

لیکن معلوم رہے کہ موجودہ زمانہ سائنس کی ترقی اور حب الوطنی کے جوش کا ہے۔ جن کی بدولت ایکطرف اگر قدرت کی طاقتوں پر فتحیابی اور کمرانی

اقوام پر حکمرانی حاصل ہونے سے ہر قسم کے سامان راحت بافراط میسّر ہو رہے ہیں تو دوسری طرف عقلی روشنی کی بدولت مجلسی رسوم اور ملکی غلامی کی قیود کو توڑنے کے ساتھ ہی مذہبی پابندیوں کو بھی الوداع کہی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بجائے حقیقی آزادی کے بدلگامی جلوہ نما ہو رہی ہے یعنی عیش و عشرت کی کثرت سے خواہشات میں حد سے زیادہ ترقی ہو کر مصداق

آب شور ست آز و تو سفری ۔ تشنگی بیش چوں تو بیش خوری

ایک طرف اگر اضطراب قلبی پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف مختلف قسم کی مصائب اور بدامنی کے علاوہ عصبی کمزوری سے خودکشی کے واقعات بھی بتدریج بڑھ رہے ہیں۔ گویا مہذب اقوام زندگی سے بیزار ہو رہی ہیں۔ لہذا امن اور شانتی اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مرض ارتقا کا کوئی نسخہ اکسیر یا امرت تلاش کیا جائے؛

چونکہ ہر قسم کی تکالیف کا انحصار افراط و تفریط یا علیحدگی کے خیال پر پایا جاتا ہے اور ان کے علاج کا دار و مدار اعتدال اور اتحاد کی زندگی یعنی یوگ (سامیہ اوستھا) میں قرار پانے پر ہے۔ اس لئے بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ یوگیشور کرشن کی تعلیم ہی موجودہ مصائب کا بہترین نسخہ ہے۔ جس میں واضح طور پر بتلایا گیا ہے کہ اندریہ۔ من اور بدھی کے اعلیٰ پہلوؤں کو اگر گیان پریم اور سیوا کے ابھیاس سے نشوونما کیا جا سکتا ہے تو ادنیٰ پہلوؤں کو جو کہ بصورت تعصبات جذبات اور توہمات یا باطل خیالات کے ذات حق کو چھپانے والے ہوتے ہیں۔ ویراگ یعنی لاپرواہی ([illegible]) کے ذریعہ نابود کیا

جا سکتا ہے یا ان کی تصحیح کی جا سکتی ہے چنانچہ اس مطلب کے لئے مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں۔

۱۔ حواس کا اثر

اگرچہ عام طور پر حواسِ خمسہ[۱] کو ہی حصول علم کا بہترین ذریعہ خیال کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت جس طرح عینک کے شیشوں کا رنگ سفید چیز کو بھی رنگین دکھا دیتا ہے یا یرقان کی بیماری میں سفید چیز زرد محسوس ہوتی ہے ویسے ہی ہر قسم کی حس کا عصب مختلف حیوانات میں ایک ہی حقیقت کو مختلف صورتوں میں محسوس کراتا ہے مثال کے طور پر ایک سڑی ہوئی لاش انسان کیلئے سخت بدبودار اور مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کتا یا گدھ اسے مرغوب خاطر سمجھتا ہوا شوق سے اس کی طرف جاتا ہے اور ایک بیل یا گدھا اس کی طرف سے بالکل لاپرواہ پایا جاتا ہے۔ ایسے ہی معمولی صحت کی حالت میں جو کھانا نہایت لذیذ محسوس ہوتا ہے بخار کی حالت میں بدمزہ پایا جاتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ تمام اشیاء عالم کا مرغوب و نامرغوب یا مکروہ معلوم ہونا انسان کے اعصاب کی بناوٹ پر منحصر ہے۔

[۱] گو مشرقی علما نے گیان اندریاں پانچ ہی بیان کی ہیں۔ لیکن مغربی سائیکالوجی کے ماہر علاوہ آواز رنگ ذائقہ بُو اور نرمی سختی کے سرد (؟) و گرمی اور درد و وزن محسوس کرنے کی قوتیں بھی ان کے ساتھ ہی شمار کرتے ہیں۔ بعد ان کے علاوہ عضلاتی حس اور بھوک پیاس یا تکان وغیرہ اندرونی احساس کو بھی ان میں شامل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ جن پر جذبات کی رنگت کا انحصار ہے۔

چونکہ اکثر صورتوں میں مرغوب الطبع اشیا مضر صحت اور ناخوشگوار ادویات مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے حواس انسانی کو سچا رہنما نہیں کہہ سکتے بلکہ دھوکا دینے والے ساکھی یا ٹھگ کی حیثیت ہی دی جاسکتی ہے اسی لئے بھگوان نے فرمایا ہے کہ "اندریوں کا ان کے وشیوں میں راگ اور دویش قدرتی ہے۔ لہٰذا ان کے پیچھے نہیں لگنا چاہیئے۔ وہی اس کے لئے رہزن ہیں"۔

(ب) جذبات نفسانی کا اثر

غرور خوف غصہ طمع اور شہوت وغیرہ جذبات میں جب جوش آتا ہے۔ تو انسان کی چشم تمیز پر ایسا اثر پردہ پڑ جاتا ہے۔ کہ وہ حق وباطل یا نیکی بدی کے فرق کو بالکل نہیں دیکھ سکتا۔ عام طور پر دنیا میں جتنا گناہ اور بے انصافی یا ظلم و زبردستی کے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں۔ زیادہ تر ان کی تہ میں اسی قسم کے ادنےٰ جذبات بصورت سبب کے محرک پائے جاتے ہیں۔ جس طرح جوش غضب کو ایک قسم کی عارضی دیوانگی کا نام دیا جاتا ہے ویسے ہی بغور دیکھا جائے۔ تو ہر قسم کا حیوانی جذبہ جوش میں آنے پر ہوش کو ایسا بگاڑ دیتا نظر آتا ہے۔ کہ اس کی بدولت انسان راہ حق کو چھوڑ کر غلط راستے پر چل دیتا ہے اسی لئے جہاں ایک طرف بھگوان نے لالچ غصے اور شہوت کو دوزخ کے تین دروازے کہا ہے۔ وہاں دوسری طرف یہ بھی واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے کہ "جو شخص اپنی زندگی میں کام اور کرودھ کے جوش کو روک سکتا ہے۔ وہی یکت اور وہی سکھی ہے"۔

بہ نظر غائر دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کی سرشت میں ہی وہ حیوانیت کا عنصر ہے۔ جس کی خرابی کی شاستروں میں خاص ہدایت

پائی جاتی ہے اور اصطلاحاً جسے "پشو یگیہ" کا نام دیا گیا ہے مصداق ؎

از ملائک حصہ داری وز بہائم نیز ہم ۔ بگذر از حد بہائم کز ملائک بگذری

ورنہ نفسانی لذات کے لئے حیوانات کو مار کر کھانا ارحم الراحمین خدا کی خوشنودی کا باعث کیسے ہو سکتا ہے؟ ؎

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قربان ۔ کرے وہ ذبح کبھی ہمکو اور لے ثواب اُلٹا

چونکہ جذبات کا جوش علاوہ فطرتی جواب عمل ہونے کے (جو کہ اکثر صورتوں میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ نقصان دہ بھی ہوتا ہے) کئی قسم کی غلط فہمی کا بھی نتیجہ ہوتا ہے۔ جیسے خوفزدہ مسافر کو درخت کا پتہ ہلنا بھی سخت خطرہ کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں ایک طرف علم حقیقی کے حصول میں سدراہ سمجھ کر غرور جیسے ادنٰے جذبات کے بالمقابل شردھا جیسے اعلٰے جذبات کے ابھیاس کی ہدایت کی گئی ہے وہاں دوسری طرف ان کے حفظ ماتقدم یا علاج کے خیال سے اعلٰے درجے کی صداقتوں کا ذہن نشین کرانا بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھتے ہوئے کہ عام طور پر لوگوں کو موت یا تکلیف کا خوف اور زندگی یا راحت کی خواہش کے ساتھ صداقت اور راستی کی نسبت غلط فہمی کا ہونا بھی مختلف قسم کے غلط اعمال کا محرک ہوتا ہے بھگوان نے دوسرے ادھیائے کے گیارھویں شلوک سے اڑتیسویں شلوک تک ان چاروں امور کی حقیقت کھول کر دکھلا دی ہے اور اسی سلسلے میں اتحاد قومی کے خیال سے آتما کے عالمگیر ہونے کی بنا پر ایک طرف اگر "سرو بھوت ہتکاری" ہونے یا لوک سنگرہ

لمہ دیکھو فلسفہ اتحاد حصہ سوم (روحانی امراض کا بیان)؀

کے لئے گرم کرنے کی ہدایت کی ہے تو دوسری طرف عقلی کمال کی عدم موجودگی میں سرد و پاپک الیشور کا دھیان کرنے اور کسی کے ساتھ دشمنی نہ رکھتے ہوئے عالمگیر محبت یعنے بھگتی کی تعلیم دی ہے کیونکہ محض اسی طریق عمل سے انسان اپنے جذبات یعنے نفس پر قابو پا سکتا ہے ؟

چونکہ جس طرح اس شخص کے لئے پھولوں کا فرش بھی راحت بخش نہیں ہو سکتا۔ جس کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہُوا ہو۔ اور برخلاف اس کے جس کے پاؤں میں جوتا پہنا ہو۔ اس کو خارزار میں بھی تکلیف نہیں ہو سکتی ویسے ہی جو شخص ادنےٰ درجے کے جذبات کا غلام ہو۔ اس کے لئے سائنس کی ایجادات بھی اطمینان بخش نہیں ہو سکتیں اور جو حق شناسی کی بدولت صحت روحانی سے بہرہ ور ہو۔ سائینس اس کے قدموں سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جس طرح چہرہ ٹھیک ہونے پر عکس خود بخود درست ہو جاتا ہے ویسے ہی صحت روحانی کی حالت میں دنیاوی کمال خود بخود سائے کی طرح پیش نظر آجاتا ہے۔ جیسا کہ وحشی اور مہذب اقوام کے حالات کا فرق دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے اس لئے یہ بیان کرنے کے بعد کہ جس طرح دُنیا میں ہر قسم کے محسوسات (گرم سرد وغیرہ) کا انحصار حواس کی حالت پر پایا جاتا ہے ویسے ہی سکھ دکھ بھی کسی بیرونی شے کے اوصاف نہیں۔ بلکہ دل کی حالت سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ بمصداق ؎

بادہ از ما مست شد نے ما ازمے ۔ ہم زماداں بُوئے گُل آوازِنے

اس امر پر خاص زور دیا گیا ہے۔ کہ حواس کے ساتھ ہی نفس کو بھی قابو میں رکھنا حصول کامیابی کے لئے لازمی ہے۔ گویا ناقابل تغیر طبیعت پر جبر نہ کرتے ہُوئے عادات کی درستی کو مدنظر رکھنا اور ابھیاس و ویراگ کے

وسائل کو کام میں لاتے ہوئے مفید مطلب قوا کو ترقی دینا اور آتم اونتی میں مصروف رہنا حصول کمال یعنے پرم گتی کا بہترین سادھن ہے۔

(ج) **توہمات باطلہ کا اثر** جس طرح چینی لڑکیوں کے پاؤں میں بچپن سے ہی لوہے کا جوتا پہنانے سے وہ قدرتی نشو و نما نہیں پا سکتے۔ ویسے ہی ابتدا میں بچوں کو جو غلط تعلیم دی جاتی ہے اس کے زیر اثر وہ اصلی صداقت کو قبول کرنے کا مادہ کھو بیٹھتے ہیں۔ جیسے باوجود اس بات کو سمجھنے کے بھی کہ چھینک یا تین اور تیرہ کے عدد کا کسی قسم کی کامیابی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ عمر بھر شگون بد کے وہم سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ یا ہر روز ہر طرف ریل گاڑیوں کے دوڑنے کے باوجود کا سفر کرنا منحوس سمجھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی لئے ہر ایک عالم وقت نے صحبت علما یعنے ست سنگ کی از حد تعریف کی ہے۔ اور برھم پراپتی یعنے اعلےٰ ترین صداقت حاصل کرنے کا اس کو بہترین وسیلہ قرار دیا ہے۔ نیز عام لوگوں سے علیحدہ رہنے یعنے بری صحبت سے بچنے کو پسندیدہ عمل ظاہر فرمایا ہے۔ جس کا اصلی مطلب نہ سمجھ کر اکثر نوجوان سنیاس لے کر پہاڑوں یا جنگلوں میں حیوانوں کی طرح زندگی گزارنا ہی باعث نجات حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت گیتا کی تعلیم کے بموجب سنیاسی وہ ہے۔ جو کہ خود غرضی کے خیال کو چھوڑ کر اپنا فرض منصبی ادا کرتا ہے۔ اور اس طرح پر نوع انسان کی خدمت میں مصروف رہتا ہے

بغور دیکھا جائے۔ تو موجودہ زمانے کے تمام مذہبی اور مجلسی مسائل کی تہ میں یہ توہمات پرستی ہی زیادہ تر کام کرتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ جب ایک

دفعہ بچوں کے اثر پذیر دماغ پر یہ بات جم گئی۔ کہ ہمارا ہی مذہبی عقیدہ خالص صداقت پر مبنی ہے ہماری ہی مقدس کتاب ذات حق سے بصورت الہام نازل ہوئی تھی۔ ہمارا ہی پیشوا، دین خدا کا خاص پیارا دوست یا بیٹا یا بھگت تھا۔ باقی سب باطل پرست اور کافر ہیں؛ تو پھر خواہ کوئی کیسی ہی زبردست شہادت کیوں نہ پیش کرے۔ عام طور پر کوئی شخص اپنے مخالف کے دعوے کی صداقت کا قائل نہیں ہوتا اور یہ ذہنی مرض نسلاً بعد نسلاً ویسے ہی اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ جیسے مرض جذام وغیرہ کا حال ہے۔ چنانچہ اسی لئے بھگوان کرشن نے ارجن کو واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ جب تک تمہاری عقل تعصب کی دلدل سے باہر نہیں نکلیگی۔ تب تک تم سنی ہوئی باتوں کو ہی سچ سمجھتے رہوگے اور جب تم مضبوط عقل سے شبد پرمان (شرتی) یعنے سنی سنائی باتوں کے اثر سے پاک ہو کر تحقیق کرنے کے قابل ہوگے۔ تبھی تم کو یوگ یعنے ذات حق کا وصال نصیب ہوگا۔ اور تم قرار حاصل کر سکو گے؛

مطلب یہ ہے کہ انسان کی بیقراری کی اصلی وجہ یہی ہے کہ اس کا عقیدہ اور عقل ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ اگر حقیقی معنوں میں اس کے خیالات جذبات اور خواہشات ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہوں۔ تو اس میں اور برھم میں فرق ہی کچھ نہیں۔ کیونکہ برھم یعنی خدا کی یہی قدرت ہے۔ کہ وہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اور وہی کرتا ہے جو کچھ اُسے کرنا چاہیئے،، گویا دوسرے لفظوں میں اس کا علم اور عمل باہمدگر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ لہذا جو شخص من بچن اور کرم میں موافقت رکھتا ہے وہ اس سے جدا نہیں کہا جا سکتا۔ اسی اصول پر ارجن کو بھگوان نے "ستھت پرگیہ

یعنی قائم العقل شخص کے اوصاف بیان کرنے کے بعد یہ فرمایا۔ کہ اسی حالت کا نام "برہمی ستھتی" یعنی خدا رسیدہ یا واصل بحق ہونا ہے اور اسی خیال کو مختلف صورتوں میں ظاہر کرتے ہوئے کہیں اس کو گنا تیت کہا گیا ہے۔ اور کہیں بھگوت بھگت۔ کہیں یوگی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور کہیں برھم بھوت یا کیت آتما وغیرہ۔ مطلب بہر حال ایک ہی ہے۔ اب جو جاہل شخص "یوگی" صرف اسی کو خیال کرتا ہے۔ جو کہ پہاڑ کی کسی غار میں چھپ کر حبس دم کئے ہوئے پاگل آدمی کی طرح مہینوں بیہوش پڑا رہے۔ یا کند مول کھا کر زندگی بسر کرتا ہو۔ وہ گیتا کی تعلیم کے بموجب اعتدال پرست شخص کو یوگی کیسے سمجھ سکتا ہے؟ حتےٰ کہ اس کو تو اگر یوگیشور کرشن خود بھی درشن دیں۔ تو وہ ان کو یوگی نہیں مانے گا۔ بلکہ بھوگی ہی خیال کرے گا۔ ایسے ہی جو آدمی دنیا کی پیدائش لفظ کُن کہنے سے یا ایک ہفتے کے عرصے میں مکمل ہونے کو اپنا عقیدۂ مذہبی بنائے بیٹھا ہے۔ اور انسان کا ظہور آدم و حوا کی پیدائش کی کہانی کی صورت میں مانتا ہے۔ اس کو سائنس کی مختلف شاخیں (ایمبریالوجی بیلی آنٹالوجی۔ کمپرٹیو اناٹومی۔ فزیالوجی اور بایوکیمسٹری وغیرہ) خواہ کتنے بھی بدیہی ثبوت بہم کیوں نہ پہنچائیں۔ مگر وہ اپنے اعتقاد کو متزلزل نہیں ہونے دے گا۔ ورنہ دوزخ کا سامنا ہے۔ یہی بات الہامی کتاب کی نسبت کہی جا سکتی ہے۔ جسکی مختلف تشریحوں اور تفسیروں کی بدولت ہر ایک مذہبی جماعت مختلف فرقوں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ ایسے ہی جس فرد بشر کو اپنی خودی کا جوہر کائنات کی ہر ایک دوسری ہستی سے علیحدہ بتلایا جا چکا ہے۔ وہ "سم درشٹی اور آتم یاجی" ہونے کی تعلیم کو

(جس کا مفصل ذکر ہم کرشن بھگتی کا نتو،، نامی رسالے میں کر چکے ہیں)
،، دفتر بے معنے ،، سے بڑھ کر وقعت نہیں دے سکتا۔ حتےٰ کہ مجلسی
چھوت چھات یا ذات پات وغیرہ مسائل کا تو ذکر ہی کیا۔ بذات خود
دہرم یا مذاہب کی نسبت بھی جو کچھ بچپن میں اس کے ذہن نشین کرا دیا
گیا ہے خلاف عادت کام کرنے کی طرح وہ اس کے برخلاف کوئی بات
سمجھنا تو درکنار۔ سُننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اسی لئے ایک طرف اگر بھگوان
نے یہ فرمایا۔ کہ" تمام لوگ میرے ہی راستے پر چلتے ہیں اور تمام پیشوایان
دین کو میرے ہی نور سے پیدا شدہ جانو ،، تو دوسری طرف یہ بھی مخفی ترین
رمز بتلا دی ہے۔ کہ" تمام دہرموں کو چھوڑ کر ایک میری شرن میں
آجا۔ میں تم کو سب گناہوں سے چھڑا دوں گا۔ مت فکر کر،، گویا
دہرم کسی خاص جماعت سے تعلق رکھنے یا کسی خاص کتاب پر ایمان
لانے یا کسی آدمی کے نام کا کلمہ پڑھنے کا نام نہیں۔ بلکہ ایک خاص قسم
کی عملی زندگی کا نام ہے جسمیں ہر پہلو سے وحدت پرستی یعنی قومی
خدمت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لئے اصلی معنوں میں دہرماتما بننے کیلئے
ضروری ہے۔ کہ انسان ہر قسم کی فرقہ بندی سے جو کہ درحقیقت ایک
قسم کی بے ایمانی یا ریاکاری پر مبنی ہوتی ہے۔ اپنے تئیں بالاتر رکھے اور
حق پرستی کی جگہ ملت پرستی نہ کرے۔ ؎

مذہب عشق از ہمہ ملت جدا است ۔ عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

اسی مفہوم کو حضرت غالب نے شعر ذیل میں ظاہر فرمایا ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں بن گئیں

بغور دیکھا جائے۔ تو دُنیا بھر کے تمام مہاپرشوں کی زندگی میں یہی ایک امر

مستنثر کہ پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے رواجی دہرم سے بندھے نہیں رہے بلکہ اس کی اصلاح کے لئے عمر بھر کوشش کرتے رہنے کی صورت میں دوسروں کو بھی راہ راست پر آنے کی ہدایت دیتے رہے۔ جس کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کے برائے نام پیروکاروں نے اپنی ہادی کے نام سے ایک مذہبی جماعت بنا کر دہرم سمجھ لیا۔ اور ایک قسم کی قید سے رہائی پا کر دوسری زنجیر سے بندھ گئے۔ ع

جینے جی چھٹی نہ پائی گردش ایام سے ۔ پڑ گیا پیچھے قفس جب جان نکلی دام سے

گویا "نوے سے اُترے اور چولھے میں پڑے" والے محاورے کی تصدیق کر دی؛

چونکہ بھگوان کرشن بذات خود دہرم اوتار تھے۔ اور دہرم کا تتو سمجھانا ہی ان کی زندگی کا مقصد حقیقی تھا۔ اس لئے جہاں ایک طرف انہوں نے اپنے اعمال سے یوگیشور یا پورشوتم ہونے کا ثبوت دیا۔ وہاں علمی طور پر بھی دہرم کے متعلق جو غلط خیالات رائج تھے۔ ان کی درستی کرنے میں پوری طاقت سے کام لیا۔ چنانچہ ارجن کو جو کہ خوفزدہ ہو کر برائے نام دہرم کا سہارا لیکر حقیقی دہرم سے بھاگنا چاہتا تھا۔ تمام ویدشاستروں کا عطر نکال کر گیتا کی شکل میں دہرم کے لافانی اور عالمگیر اصولوں کو سمجھایا۔ جسکی بدولت وہ اپنے تمام شکوک مٹا کر اصلی دہرم پر کاربند ہُوا؛

لیکن اس جماعت بندی یا کتاب پرستی کی تردید کرنے پر ہی انہوں نے اکتفا نہیں کی۔ جسکو غلط فہمی سے عام لوگ دہرم سمجھتے ہیں۔ بلکہ اسی قسم کی ایک دوسری غلطی جو دہرم کے مفہوم میں شامل پائی جاتی ہے۔ یعنے

خاص قسم کی بیرونی رسوم یا اعمال کو ہی جو لوگ دھرم خیال کرتے ہیں۔ اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ نہ صرف ان اعمال کا ہی مضحکہ اڑایا جن کو سورگ پراپتی کے وسائل کی حیثیت سے خاص وقعت دی جاتی ہے اور ان کو حق پرستی یعنے دھرم کے برخلاف قرار دیا۔ بمصداق ؎

زاہد کو کون کہتا ہے یہ حق پرست ہے - حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

بلکہ روحانی صحت پر توجہ دلانے کے خیال سے اس امر پر بھی خاص زور دیا۔ کہ کسی کرم کا اچھا ہونا اس کے بیرونی نتائج پر منحصر نہیں بلکہ عامل کی نیت کی پاکیزگی پر انحصار رکھتا ہے بقول غالب ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ - دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

گویا وہی عمل جو ایک حالت میں اچھا کہا جاتا ہے۔ دوسری حالت میں بُرا بن جاتا ہے۔ اور جو ایک وقت میں خودغرضی کی وجہ سے بُرا خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرے وقت میں ہمدردی یا خود ایثاری کی بدولت نیکی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جیسے سنکھیا وغیرہ زہر بھی بیماری میں امرت کا کام دیتی ہیں۔ اس لئے کسی بیگناہ کو تکلیف دینا اگر بُرا کام ہے تو ایک قاتل یا ڈاکو کو سزا نہ دینا بُرائی بن جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ دھرم کسی خاص جسمانی عمل کا نام نہیں۔ بلکہ اس کا تعلق انسان کی باطنی ہستی یعنے ارادے سے ہے اسی لئے آپ فرماتے ہیں کہ ہے ارجن کرم کیا ہے؟ اور اکرم کیا ہے (یعنے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا چاہئے) ان سوالات کے حل کرنے میں بڑے بڑے عالم شخص بھی گھبرا گئے ہیں۔ لہذا میں تمہیں وہ راز کی بات بتلاتا ہوں۔ جسکو سمجھ کر تم اس کشمکش سے آزاد ہو جاؤ گے۔ ور جو شخص نیکی میں بدی اور بدی میں نیکی

کا بیج مخفی دیکھتا ہے وہی سب سے اعلےٰ درجے کا عقلمند اور اہلِ تدبیر ہے،، گویا جس طرح دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں۔ جس کا صرف ایک پہلو ہو۔ دوسرا نہ ہو۔ ویسے ہی کوئی ایسا نیک عمل بھی نہیں جسمیں کسی پہلو سے "دوش،، یعنے نقص نہ ہو۔ اس لئے جس طرح ڈاکٹر لوگ کسی بیماری کا علاج کرنے میں بمقابلہ علامات کے اس کے سبب کو دور کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ ویسے ہی ہر فرد بشر کو چاہیئے۔ کہ وہ بجائے بیرونی اعمال پر نگاہ رکھنے کے لوک سنگرہ، اور نشکام بھاونا یعنے قومی بہبودی کے خیال پر خاص توجہ رکھے۔ بقول لبیکہ۔ ؎

نیت اگر ہو ٹھیک تو سب کام بھی ہو ٹھیک۔ آغاز گر ہو ٹھیک تو انجام بھی ہو ٹھیک

الغرض جسطرح کسی کپڑے کو رنگنے سے پیشتر اس کو صاف کرنا ضروری ہوتا ہے ویسے ہی گیتا کا اصلی تتو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ انسان اپنے باطن کو مذکورہ بالا سہ قسم کے تعصبات و توہمات سے پاک کرے۔ بلکہ اگر ممکن ہو۔ تو بیداری اور خواب وغیرہ کی حالتوں میں جو قوت آگاہی ایک ہی عالم کو مختلف صورتوں میں محسوس کراتی اور ذات حق کو حدود ادراک سے بالاتر ثابت کرتی ہے اس کی قیود سے بھی اپنی خودی کو آزاد کر کے خدا سے ہم آہنگ بنانے میں مصروف رہے۔ جس خیال سے مختلف علمانے مختلف قسم کے زہد و ریاضت کے عمل تجویز کئے ہیں۔ ورنہ جسطرح گدلے اور متحرک پانی میں سورج کا صحیح عکس نظر نہیں آتا۔ ویسے ہی بیقرار اور تاریک دل میں نور عرفان جلوہ فگن نہیں ہو سکتا۔

اسی اصول پر عمل۔ دکشیپ اور آورن نامی نقائص ذہنی کیلئے اہل علم نے

مل خواہش لذات۔ اضطراب قلبی اور جہالت؛

بالترتیب کرم ۔ بھگتی اور گیان کے نسخے تجویز فرمائے ہیں ۔ جن کی اصل حقیقت کے سمجھنے میں دھوکا کھا کر اکثر اصحاب نے گیتا کو بھی ان سہ امور کا علیحدہ علیحدہ چھ چھ ادھیاؤں کی صورت میں یا بحیثیت مجموعی کسی ایک قسم کا ہی شاستر ظاہر فرمایا ہے ۔ جیسا کہ فلسفہ اتحاد کے دوسرے حصے میں لکھا جا چکا ہے ۔ حالانکہ درحقیقت جس طرح موہن بھوگ اپنے ہر ایک حصے میں میدہ گھی اور میٹھا شامل رکھتا ہے ویسے ہی گیتا کے ہر ایک ادھیائے کی صورت ہے گویا درخت کی جڑ میں پانی ڈالنے کی مانند جو کہ ہر ایک شاخ اور پھول پتے وغیرہ میں پہنچ جاتا ہے بھگوان کرشن نے ایسے پورن یوگ کی تعلیم دی ہے ۔ جس کا انسانی سرشت کے ہر ایک پہلو پر یکساں طاقت بخش اثر پیدا ہو اور خیالات جذبات اور خواہشات میں افراط و تفریط دور ہو کر ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے ۔ کہ برہم نروان کے حصول میں کوئی پردہ حائل نہ رہے تھا ایسے ہی دھارمک بھاؤ یعنی آچار اور وچار کے مجموعے کو ایک لفظ میں " برھمچریہ " کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ جس کا مفہوم عام طور پر محض مجردانہ زندگی بسر کرنا ہی سمجھا جاتا ہے ۔

مہاتما گاندھی نے ایک دفعہ نوجوان طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا ۔ کہ اگرچہ ستوگنی بھوگن اور ورزش طاقت بڑھانے کے لئے نہایت ضروری ہیں ۔ لیکن اگر ان کے ساتھ ہی برھمچریہ قائم نہ رکھا جائے ۔ تو ان کا اثر بہت حد تک زائل ہو جاتا ہے ۔ ہمارے بھارت ورش میں آجکل اچھوتے (original) خیالات پیش کرنے والوں یا ایجاد و اختراع کے مادے کی اسی لئے

کمی ہے کہ یہاں برہم چریہ کے اصول پر بہت کم عمل کیا جاتا ہے۔ گو اس مضمون میں بھی برہمچریہ سے مراد ویریہ رکھشا یعنی مجرد رہنے اور سجین کی شادی کی ممانعت کرنے سے ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت جس طرح کائینات میں نت نئی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے یعنی جو بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے وہ ان تمام اشخاص سے جو گزر چکے ہیں یا موجود ہیں بالکل نرالی صورت رکھتا اور بآسانی تمیز کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی ہر ایک درخت کا ہر ایک پتہ موسم بہار میں نئے سے نیا جلوہ دکھاتا اور برھم کی اننت شکتی کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے بمصداق ؎

دلبر دلبرہائے من سکیند از برائے من ۔ نقش دلنگار و رنگ و بو تازہ بتازہ نو بنو

ویسے ہی انسان کے خیالات میں بھی نئی اصلیت کی جھلک تبھی آ سکتی ہے۔ جبکہ وہ کسی قسم کی ذہنی پابندی میں گرفتار نہ ہو۔ بلکہ رب العالمین یعنی ذات حق سے ہم آہنگ ہو کر اپنے تئیں ہر قسم کی فرقہ دارانہ قیود یعنی جنم اور کرم کے بندھنوں سے آزاد کرے۔ بالفاظ دیگر حقیقی معنوں میں "برھم چاری" بن جاوے۔ اسی مفہوم کو بھگوان نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔

"وید کے جاننے والے جسے اکشر یعنی لافانی کہتے ہیں۔ ہر قسم کے دنیاوی تعلقات یعنی دلچسپی سے بالاتر ہو کر جتی لوگ (ضبط کرنے والے) جس میں پرویش کرتے ہیں۔ اور جس کی خواہش میں برہمچریہ برت دھارن کیا جاتا ہے۔ وہ پد (اونکار برھم) تجھے مختصر طور پر بتلاتا ہوں۔ تمام حواس ظاہری اور خیالات باطنی کو ضبط میں لا کر اس ایک اکشر برھم اوم کا جپ اور میرا

تصور کرتا ہوا جو شخص زندگی گزارتا ہے اسے پرم گتی یعنے اعلےٰ ترین درجہ حاصل ہوتا ہے ۔ بمصداق ؎

بتوں کا دل سے میں پڑھتا ہوں کلمہ ۔ زباں پر ہے مرے نام خدا بھی

چونکہ مہابیر ہنومان ۔ یکشمن جتی ۔ بھیشم پتامہ اور سوامی دیانند وغیرہ کے نام سے منسوب شدہ برہمچریہ بھی دہرم کے تمام انگوں میں اعلےٰ ترین درجہ رکھتا ہے ۔ تو پھر اچھوتانند بھگوان کرشن کی ذات بابرکات سے تعلق رکھنے والا تو یقیناً اتنا افضل کہا جاسکتا ہے ۔ کہ برہم کے ہی وچار اور آچار کا مظہر ہو ۔ لہذا ضروری ہے ۔ کہ گیتا کے نقطۂ نگاہ سے برہمچاری کے علمی اور عملی ہر دو پہلوؤں کی نسبت قدرے وضاحت سے ذکر کیا جاوے ۔

(۱) برہم وچار برہم وچار سے مراد علم حقیقی سے ہے اور یہ اسی مہاتما کو حاصل ہوتا ہے ۔ جوکہ ہر قسم کی قیود سے آزاد ہوکر ذات حق سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔ اور بمصداق ؎

باوجودیکہ پرو بال نہ تھے آدم کے ۔ پہنچا اس جا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

دیوتاؤں سے بھی اعلےٰ درجہ حاصل کر لیتا ہے ۔ سوال ہو سکتا ہے ۔ کہ ایسا شخص دنیا کی حقیقت ۔ روح کی ماہیت اور خدا کی اصلیت کے متعلق کیا خیالات رکھتا ہے ؟ اور سچائی کی بہترین کسوٹی کیا سمجھتا ہے ؟ اگرچہ اس مجموعہ سوالات کا مفصل جواب تو گیان یوگ کے عنوان سے فلسفۂ الٰہی کے تیسرے حصے میں دیا جاچکا ہے ۔ لیکن مختصراً یہ عرض ہے ۔ کہ ایسا راگ دویش سے بالاتر ۔ سکھ دکھ کو یکساں سمجھنے والا ۔ تعصبات اور توہمات

پرستی سے آزاد لبشر جو کہ انسانی صورت میں خدائی کا جلوہ دکھاتا اور حقیقی معنوں
میں اوتار کی حثیت رکھتا ہے تمام واقعات عالم کو تغیر پذیر اور حقیقت کائنات
کو لاتغیر دیکھتا ہوا مسئلہ اوتار یعنی قانون ارتقا کے بموجب اس دُنیا کو ایک
ایسے درخت[1] کی صورت خیال کرتا ہے جس کی جڑ (ایکمیو ادیتم برہم) اوپر اور
جمادات نباتات حیوانات اور انسان کی شکل میں شاخیں تبدریج نیچے کی
طرف پھیلتی چلی آئی ہیں۔ جن کے اندر ایک ہی چیتن رُوپی رس دورہ کرتا
اور سب کو ویسے ہی زندگی بخشتا ہے۔ جیسے ایک ہی سورج تمام اشیائے
عالم کو روشن کرتا ہے اور باہمہ آکاش (ایتھر) کی طرح سب کے اندر موجود
رہتے ہوئے بھی ان کے اثرات سے متوثر نہیں ہوتا۔ گویا تمام اختلافات
ظاہری ہیں باطنی وحدت کو محسوس کرتا اور خودی یا خود غرضی کی قیود سے
آزاد (اسنگ) رہتا ہے۔ بمصداق ؎

برہم گیانی سدا نرلیپ ۔ جیسے جل میں کمل الیپ

چونکہ ایک ہی ذات کے مختلف صفات میں جلوہ نما ہونے کی وجہ
سے برائے نام اعلےٰ و ادنےٰ کی تمیز کچھ معنے نہیں رکھتی۔ اس لئے
مختلف اعضاء بدنی کی طرح سب افراد قوم کو وہ ایک ہی نگاہ سے دیکھتا
اور اسی اصول کو عملی زندگی میں اختیار کرنا (لوک سنگرہ) حق پرستی کا
صحیح مفہوم خیال کرتا ہے بالفاظ دیگر ہر شے میں سرو ویاپک برہم کے ہی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ برہم گیانی شخص پیدائش عالم اور آدم کو ایک ہفتے کی کاروائی یا
لفظ کُن کہنے کا فوری جواب عمل نہیں خیال کرتا۔ بلکہ ایک چیتن شکتی کے کروڑوں برس
سے لگاتار باقاعدہ عمل ترقی کا نتیجہ سمجھتا ہے جیسا کہ اکثر اہل سائینس کا بھی دعوے ہے

صفحہ ۹۸

درشن کرتا ہے بمصداق ؎
جو کچھ دیکھے جگت میں سب ایشور میں ڈھانپ ۔ کر وچین اس تیاگ سے دھن لالچ سے کانپ
چونکہ دھارمک تعلیم کا تعلق محض انسانی صورت سے وابستہ ہے اور عقلی
انواع کے لحاظ سے بھی یہی سب سے اعلیٰ درجہ رکھتا ہے ۔ اس لئے سنجر کائنات کے

جو کہ ایتھر یا الیکٹرون سے اٹیم ۔ مالیکیول ۔ اور سیل کی وساطت سے اجسام (آرگینزم) کا صدور پذیر ہونا بیان کرتے ہیں اور "تیول" کو جیوتی سروپ مانتے ہیں ۔ چونکہ جسطرح عالم بیداری کی آگاہی سے خواب کی آگاہی مختلف ہوتی ہے ویسے ہی نہ صرف انسانی زندگی ہی جسمانی سیلز کی زندگی سے علیحدہ ہوتی ہے (حتیٰ کہ اکثر صورتوں میں انسان کے مر جانے کے بعد بھی اسکے دل کو موزون حالات میں رکھکر برسوں زندہ رکھا جا سکتا ہے) بلکہ انسانی آگاہی سے سیل کی آگاہی بھی مختلف صورت رکھتی ہے (جیسا کہ انسان کے خود اپنے جسمانی اعضا مثلاً جگر و گردوں وغیرہ کے عمل سے ناواقف ہونے سے ثابت ہے) اور جو نسبت جسم کو سیل سے ہے وہی سیل سے مالیکیول یا اس سے اٹیم کو ہے اس لئے مغربی سائنس کی ویدانت کے اس سدھانت سے بھی مطابقت معلوم ہوتی ہے کہ جسم کثیف کے علاوہ جسم لطیف و الطف بھی آتما کے ظہور میں پردے کا کام دیتے ہیں گویا اٹیم اور آتم محض لفظی مشابہت ہی نہیں بلکہ خاص حد تک معنوی مشابہت بھی رکھتے ہیں چونکہ اٹیم بھی آگ پانی اور ہوا وغیرہ سے فنا نہیں ہوتا ۔ اس لئے اس پہلو میں بھی آتما کی مثال کا مظہر ہے نیز جیسے اس کا ایتھر میں ملنا ممکن ہے (جو کہ ریڈیم کے ذرات ٹوٹنے سے ثابت ہوتا ہے) ویسے ہی آتما برہم میں مل جاتا ہے ۔ غرض مشرقی اور مغربی محققوں کی تحقیقات کی مشابہت ذیل کی صورت میں دکھائی جا سکتی ہے ۔

(دیکھو حاشیہ صفحہ ۹۹ پر)

پتوں کو وہ وید کے منتروں سے تشبیہ دیتا ہے۔ گویا جسطرح موسم بہار میں ہرسال درختوں میں نئے پتے نکلتے ہیں۔ ویسے ہی انسان کے قوائے ذہنی کی ترقی کیساتھ اس کے پرانے عقائد بھی نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ لہذا ویدوں کی شاکھاؤں میں (سائنس کی شاخوں کی طرح) برابر اضافہ ہوتا اور وید کے انگوں میں وسعت آتی رہتی ہے پس وید کو معیار صداقت مانتے ہوئے بھی وہ اس کے مفہوم کو بجائے خاص کتاب کے عالمگیر اصول علمی قرار دیتا ہے۔ گویا برہم گیانی ہونے پر وہ بجائے کسی خاص پرانی کتاب پر ایمان لانے کے خود ہی مینار روشنی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جبکی ہر ایک بات عوام الناس کے لئے موجب رہنمائی اور ہر ایک حرکت قابل تقلید بن جاتی ہے بقول اپنشد اس جی
برہم گیانی برہم وت اسکی بانی وید ۔ بھاشا اتھوا سنسکرت کرت بھید بھرم چھید

(۲) برہم آچار

برہم وچار یعنے تحقیق حق کرنے پر نہ صرف توحید ذات کا ہی کامل یقین ہو جاتا ہے۔ بلکہ ظہورات عالم میں قانون علت و معلول یعنے اسباب و نتائج کے تعلق کے عالمگیر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہتا۔ گویا منزل حقیقی پر پہنچے ہوئے شخص کو چشم بصیرت (گیان چکشو) کھلنے سے ہر ایک کرم کا پھل سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا ہوا نظر آتا ہے لہذا عام لوگوں کی طرح نہ صرف حرص و ہوس کا ہی شکار نہیں ہوتا

اچنت شکتی	-	برہم	=	جیوتی سروپ الیکٹرون
تریا	-	آتما	=	ایٹم
سکھوپتی	-	کارن شریر	=	مالیکیول
سوپن	-	سوکشم شریر	=	سیل
جاگرت	-	استھول شریر	=	اجسام (آرگنزم)

بلکہ ثمرۂ اعمال کی خواہش میں بھی بیقرار نہیں ہوتا۔ گویا نشکام کرم اس کی زندگی کا معمول ہو جاتا ہے یا یوں سمجھیں۔ کہ وہ اپنے فرائض منصبی (سودھرم) کی ادائیگی کو ایک قسم کا کھیل (لیلا) خیال کرتا ہے۔ جسمیں کام کو کام کی خاطر پیار کیا جاتا ہے۔ نہ کہ کچھ حاصل کرنے کی تمنا ہوتی ہے۔

چونکہ پنڈ[علہ] اور برہمانڈ یعنے جسم و جہاں ہر دو صورتوں میں یکساں بغرض خدمت کا اصول (جسے ویدک اصطلاح میں یگیہ کہا جاتا ہے) عالمگیر طور پر پایا جاتا ہے (جسے پرماتما کی لیلا کا نام دیا جاتا ہے) اس لئے سچے یوگی کی روش زندگی قدرت کی تقلید کرنے کی بدولت برہم سے ہم آہنگ ہوتی اور حقیقی معنوں میں برہم چریہ کا مفہوم ادا کرتی ہے۔

اسی طرز عمل کو نیاگ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ جس کی تعریف اوپنشدوں میں ہی نہیں بلکہ گیتا میں بھی جابجا پائی جاتی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسی تتو کو نہ سمجھنے کی بدولت گیتا کی نسبت عام لوگوں کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ یہ دنیا سے قطع تعلق کرنے کی ہدایت کرتی ہے حالانکہ درحقیقت بھگوان کرشن نے ترکِ دنیا یا زاہدانہ نفس کشی کی کہیں بھی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی یوگی کو (جو کہ اتحاد نفسانی کی صورت میں خاص قسم کے کیریکٹر کا آدمی ہوتا ہے) کسی قسم کی راحت کا ترک کرنا ضروری ظاہر فرمایا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے

علہ جسطرح اعضا بدنی ایک دوسرے کی امداد کرتے اور یکتائی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں ویسے ہی کائنات میں بھی نہ صرف سورج چاند ہوا اور دریا وغیرہ ہی فیض کے چشمے بہاتے ہیں۔ بلکہ بحیثیت مجموعی نباتات و حیوانات بھی ایک دوسرے کے لئے کارآمد ہو کر ارتقاء عالم میں معاونت کرتے ہیں اور وحدت حق کی دلیل دیتے ہیں اسلئے اسی طرز عمل کو اختیار کرنا خدا کے رنگ میں رنگے جانے کا مترادف قرار دیا جا سکتا ہے جس حالت میں قرار پذیر ہو کر کرم کرنے پر انسان گناہ کی آلائش سے ویسے ہی پاک رہتا ہے۔ جیسے کمل کا پتا پانی میں۔

نہیں۔ کہ وہ لذات حواس کو راحت کی خاطر پیار کرے۔ بلکہ اصلی مطلب یہ ہے۔ کہ اپنا
دہرم پالن کرتے ہوئے جو سرور حاصل ہو۔ اس سے نفرت نہ کرے۔ مثلاً کھانا صحت
کے لئے ازبس ضروری ہے لہٰذا اگر وہ لذیذ بھی ہو۔ تو چنداں مضائقہ نہیں۔ مگر یہ ہرگز
نہیں ہو سکتا۔ کہ اٹلی کے مشہور امیر کی طرح وہ لذیذ اغذیات کھانے میں خاص
دلچسپی لے۔ ایسے ہی اولاد پیدا کرنے کے عمل میں لذت جماع سے بہرہ ور ہونا قدرتی
امر ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے رنگیلے اور عیاش طبع لوگوں کی طرح مقوی باہ
ادویات کا استعمال کر کے حظ نفسانی میں مصروف رہنا اس کے لئے یقیناً ممنوع
ہی ہے۔ نیز وہ فطرتاً خود ہی ان کو مکروہ خیال کرتا ہے۔ کیونکہ نہ صرف اس سے
جسمانی اعضا ہی گھن لگی ہوئی لکڑی کی طرح مقابلۂ امراض کی طاقت سے
خالی ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ذہنی قوا میں بھی ایک طرف اگر بے آہنگی پیدا ہو کر یوگ
کی متضاد حالت پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ تو دوسری طرف عادتِ خیال
میں ایسی خرابی پیدا ہو جاتی ہے کہ خاص کیفیت باطنی کو روحانی ترقی کے لحاظ
سے اعلےٰ ترین خوبیوں کا مجموعہ سمجھنے کے باوجود لگاتار قائم رکھا نہیں جا سکتا
گویا عقلی تیزی کی بدولت برھمانند کی حالت اسے بجلی کی طرح نظر تو آ جاتی ہے۔
لیکن سورج کی روشنی کی طرح دیرپا نہیں ہوتی۔ بالفاظ دیگر لوگ سمادھی کا انحصار
جس استقلال طبع پر ہے۔ وہ نفس پرست شخص میں نہیں رہتا۔ اور وہ بجائے
ایک رس رہنے یعنی سامیہ اور سمتر بدھی رکھنے کے پنڈولم کی طرح بیقرار اور
دمبدم مختلف جذبات کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ تمام فطرتی خواہشات یا طبعی
رجحانات کو ہم آہنگ رکھنا اسی صورت میں ممکن ہے۔ جبکہ نہ صرف پیدائشی نقائص
(افراط و تفریط) کو ہی دور کیا جائے۔ جو کہ تعلیم و تربیت پر مبنی ہے۔ بلکہ کسی شے
یا عمل سے دلبستگی بھی نہ ہونے پائے۔ جو کہ شرابی یا افیونی کی طرح عادت سے

پیدا ہو کر انسان کو راہ راست پر چلنے میں مانع ہوتی ہے۔ بمصداق ؎
نبایدلبستن اندر چیز و کس دل - کہ دل برداشتن کارے ست مشکل
بغور دیکھا جائے۔ تو تمام نوع انسان دو قسم کی پابندیوں میں ہی مبتلا نظر آتی ہے
اوّل وہ جماعت جو کہ ناقابلیت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکتی اور جسمانی اور
عقلی وغیرہ مختلف پہلوؤں سے اپنی کمزوری کا رونا روتی رہتی ہے۔ دوسری وہ
جماعت جو کہ قابلیت تو رکھتی ہے۔ لیکن دولت کے لالچ یا کنبے کی محبت یا خاص
قسم کے غرور (خاندانی یا قومی وغیرہ) کے وہم کی وجہ سے سیدھے راستے پر چل نہیں
سکتی۔ لہذا ان دونوں قسم کی قیود یا بندھنوں کو دور کرنے کے لئے جہاں ایک
طرف یوگ کی تعلیم میں ابھیاس پر زور دیا گیا ہے۔ وہاں دوسری طرف اس کے
ساتھ ہی ویراگ یعنی بے تعلقی پر بھی خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ مطلب مختصر یہ
کہ جس طرح بگھی کے گھوڑوں کو غلط راستے پر چلنے کے احتمال سے مار دینا ٹھیک
نہیں۔ وہاں اس کے بالمقابل بے لگام چھوڑ دینا بھی درست نہیں۔ بلکہ چابک
اور لگام کی مدد سے قابو میں رکھ کر چلانا ہی صحیح ہوتا ہے۔ ویسے ہی گیتا میں کٹھ
اونیشد کی تعلیم کے بموجب عقل کو بحیثیت کوچوان ہوشیار رکھنے اور حواس
کو من کی لگام سے ضبط کرنے یا ایشا واسیہ اونیشد کے فرمان کے بموجب تیاگ
سے بھوگ بھوگنے کی ہی بار بار ہدایت کی گئی ہے اور اسی طریق عمل کو مکتی کا لاثانی
راستہ بیان فرمایا ہے۔ جیسا کہ بھگوان کے ان مقولوں سے ظاہر ہوتا ہے۔
"جس طرح اپنی حدود سے باہر نہ جانے والے سمندر میں چاروں طرف سے
دریا گرتے ہیں۔ ویسے ہی جس شخص کو اپنے آتما میں مست رہنے پر ہر قسم کی لذات
حاصل ہوتی ہیں۔ اس کو سچی شانتی ملتی ہے۔ نہ کہ اس کو جو لذات محسوسات کا
متلاشی ہوتا ہے" اپنا فرض ادا کرنے اور کرم پھل کا نہ چاہنے والا ہی سچا سنیاسی

اور ہوگی ہے۔ نہ کہ بھگوے کپڑے پہن کر بھیک مانگنے والا یا آگ سے بچکر بیکار رہنے والا ؛؛ بھگوت گیتا ادھیائے چھٹا شلوک پہلا ؛

یگیہ، دان اور تپ کو مانسک پوترتا کے سادھن قرار دینا۔ اور اپنے دہرم کرم نشکام بھاؤ سے کرنے پر سدھی کا پراپت ہونا۔ یا الیشور ارپن کرموں سے بھگوان کا پرسن ہوکر اپنے بھگت کو برہم روپ بنا دینا وغیرہ درحقیقت اس تیاگ بدھی سے کمال حاصل ہونے کو ہی ذہن نشین کرانے کیلئے اٹھارویں ادھیائے میں بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی اصول کی بنا پر خودی اور خودغرضی کے تعلقات کو چھوڑ کر کئے گئے کرم اور کرتا یا اس کی بدھی کو ستوگنی یعنے اعلیٰ ترین درجے کی کہا گیا ہے ؛

مطلب یہ کہ تیاگ کا تعلق باطن سے ہے نہ کہ ظاہر سے۔ جو شخص اس کے برخلاف عمل کرتا ہے۔ گیتا کے الفاظ میں اس کو ریاکار یا مکار ہی کہا جا سکتا ہے نہ کہ تیاگی۔ بمصداق :

کلید در دوزخ ست آں نماز - کہ بر روئے مردم گذاری دراز

تقسیم دوگانہ

اگرچہ گیان اور کرم کی اسی ظاہری تقسیم کے لحاظ سے جو کہ درحقیقت ایک ہی صداقت (برہم پریہ) کے دو پہلو ہیں۔ گیتا کے مضمون کو سانکھیہ اور یوگ کے نام سے دو حصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بغور دیکھنے پر علی وہ تھیوری اور پریکٹس (علم و عمل) کے ان الفاظ میں انیلے سس اور سنتھے سس (توڑ اور جوڑ) یا آبجکٹو اور سبجکٹو (بیرونی اور اندرونی علم) کے تصورات بھی مخفی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ جہاں ایک طرف سانکھیہ لفظ سنکھیا یعنے گنتی کا اور یوگ لفظ ملانے یعنے ترکیب کا مفہوم ظاہر کرتا ہے وہاں دوسری طرف سانکھیہ درشن

اگر کشتر کشتر ودیا کو اپنا مقصد بنا کر بیرونی کائنات یعنے پرکرتی کی تشریح کرتا ہے۔ تو یوگ درشن کشیتر کشیترگیہ ودیا کی طرف توجہ پھیر کر چت درتیوں کے ہم آہنگ کرنے یعنے اپنے سروپ میں قیام پذیر ہونے کے سادھن بتلاتا ہے۔ باینہمہ مبادا کوئی طالب علم غلط فہمی سے سانکھ درشن اور یوگ درشن کی طرح گیان اور کرم نشٹھا کو۔ جو کہ مرکز اور محیط کی طرح محض خیال میں ہی تمیز کئے جا سکتے ہیں نہ کہ واقعی علیحدہ کئے جانے ممکن ہیں۔ ایک دوسرے سے جدا سمجھ لے۔ پانچویں ادھیائے میں واضح الفاظ میں ان کی وحدت حقیقی ظاہر کرنے کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی پورے طور پر قرار پذیر ہونا دونو کا مطلب پورا کر دیتا ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانے کی سائیکالوجی بھی اسی امر کی تصدیق کرتی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر ووڈ ورتھ صاحب لکھتے ہیں۔ کہ گیان کا کام اگر واقعات و حادثات یا اوصاف اشیاء اور ان کے باہمی تعلقات کا دریافت کرنا ہے۔ تو کرم کا کام ان میں خاص قسم کی تبدیلیاں پیدا کرنا ہے۔ گو یا معمولی اشیاء کے دیکھنے اور سونگھنے وغیرہ سے لے کر قوانین قدرت کی تحقیقات تک (جن پر خاص معنوں میں لفظ ڈسکوری Discovery عائد ہوتا ہے) اگر گیان کام کرتا ہے۔ تو بچے کے کھلونوں سے کھیلنے یا مختلف کلیں بنانے سے لے کر اعلےٰ درجے کے فن انجنیری یا حکومت کے انتظام کرنے تک (جن پر لفظ انوینشن Invention کا اطلاق ہو سکتا ہے) کرم کے حلقے میں سما جاتا ہے۔

مطلب یہ کہ گیان اگر یہ معلوم کرتا ہے۔ کہ کائنات میں کیا ہے؟ تو کرم اسمیں تغیر پیدا کرتا ہے لیکن بغور دیکھا جائے۔ تو صاف طور پر نظر آ جاتا ہے۔ کہ جب تک کوئی شخص کسی شئے کو جانتا ہی نہیں۔ تو اس میں مطلوبہ تبدیلی کیسے

پیدا کر سکتا ہے؟ اور اگر اس کو اپنی جگہ سے ہلاتا ہی نہیں تو اس کا علم کیسے مکمل ہو سکتا ہے؟ غرض یہ کہ جسطرح بچہ کسی کھلونے کو پہلے ہاتھ میں پکڑنے کے لئے حرکت کرتا ہے پھر اسکو ادھر اُدھر گھماتا اور فرش پر گرا کر اس کی آواز سنتا ہے۔ تو دونو صورتوں میں اس کے خواص دریافت کرتا ہے۔ ویسے ہی سائینسدان خوردبین وغیرہ کسی نئی ایجاد کی بدولت علمی ترقی کرتا ہے، جو کہ بذات خود اعلےٰ درجے کے علم پر مبنی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک طرف اگر تیرنا تیرنے سے آتا ہے یا بائیسکل پر چڑھنا خاص قسم کی مشق کرنے سے ہی ممکن ہے۔ وہاں دوسری طرف دیکھنا سننا بھی دیکھنے سُننے سے ہی آتا ہے۔ گویا صحیح عمل کے لئے اگر صحیح علم کی ضرورت ہے۔ تو صحیح علم کا انحصار لگاتار عمل کرنے پر پایا جاتا ہے۔ پس درحقیقت دونو کا ایک دوسرے سے ناقابل علیحدگی تعلق رکھنا امر واقع ہے۔ اسی لئے ایک طرف اگر علماءِ مغرب کا یہ فرمان ہے۔ کہ "ہم کام کرنے سے ہی سیکھتے ہیں (کیونکہ نہ صرف تجربہ بلکہ مشاہدہ بھی ایک قسم کا عمل ہی ہے) تو دوسری طرف گیتا میں بھی یہ صاف پایا جاتا ہے۔ کہ "تمام اعمال کا خاتمہ علم میں ہی ہوتا ہے" اور گیان اصلی معنوں میں عملی زندگی کا ہی نام ہے (۱-۳۴) بمصداق ؎

علم چندانکہ بیشتر خوانی — چوں عمل در تو نیست نادانی

اگرچہ کرم کا تعلق عضلات سے اور گیان کا عصبی مرکزوں یا دماغی اجزا کی نشوونما سے ہے۔ لیکن صحت انسانی کے نقطۂ نگاہ سے دونو یکساں پیش نظر رکھنے ضروری ہیں۔ اسی صداقت کا ذہن نشین کرانا یوگ کی تعلیم کا حقیقی منشا ہے۔ تاکہ قوائے ذہنی و ارادی میں کسی قسم کی پھوٹ پیدا ہو کر "بدھی بھید" کی حالت نہ ہو جائے۔ بلکہ رابطہ اتحاد قائم ہو کر انسان خاص کیریکٹر کا مالک

بن سکے۔ جس کی بدولت برھم سے ہم آہنگ ہونا ممکن ہے ؏

تقسیم چہارگانہ

چونکہ عام طور پر ہندوؤں میں وید۔ درن آشرم اور یگ وغیرہ کی صورت میں تقسیم چہارگانہ کو خاص وقعت دی گئی ہے اور پورانوں میں ہر فرد بشر کو بجائے آدم کے چتر مکھ برھماجی کی اولاد قرار دیا ہے۔ یعنی بلحاظ جسم دل دماغ اور رُوح کے اس کی سرشت کو چار پہلو والی تسلیم کیا ہے۔ اس لیے تکمیل فطرت کے وسائل کے خیال سے بجائے مذکورہ بالا دو حصوں کے گیتا کے مضمون کو کرم بھگتی گیان اور یوگ نامی چار حصوں پر بھی مشتمل مانا جاسکتا ہے۔ لیکن بعض اصحاب ان میں سے کسی ایک پہلو کی ہی گیتا میں خاص تعلیم خیال فرماتے ہیں اس لیے ان کی غلط فہمی رفع کرنے کی غرض سے ذیل میں مختصر طور پر یہ دکھایا جاتا ہے کہ بذات خود گیتا اس بارے میں کیا کہتی ہے؟

(۱) کرم یوگ

چونکہ لوکمانیہ تلک اپنی مشہور عالم تصنیف گیتا رہسیہ میں اس امر کو بالتفصیل بیان کر چکے ہیں۔ کہ گیتا کرم یوگ کی برتنک ہے۔ اس لئے جو لوگ اسے گیان یا بھگتی پردھان شاستر مانتے ہیں ان کی خدمت میں صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہوگا۔ کہ وہ اس امر پر غور فرمائیں۔ کہ اس کی تعلیم کا محرک کیا تھا؟ اور اس کا انجام کیا ہوا؟ کیونکہ مہابھارت کے میدان میں جب کورو پانڈو کی فوجیں صفیں باندھ کر جنگ کے لئے ہشیار ہو چکی تھیں۔ ٹھیک اس وقت اپنے بزرگوں اور رشتہ داروں کو بالمقابل دیکھ کر ارجن کے دل میں ایک عجیب قسم کا جذبہ طاری ہو گیا۔ جس کیفیت کے زیر اثر وہ اپنے فرض کو چھوڑ کر گیان دھیان کی زندگی کو پسندیدہ ظاہر کرنے لگا۔ لیکن بھگوان کو اس کی یہ روش ایک آنکھ نہ

بھائی۔ چنانچہ پہلے تو آپ نے اس کو ملامت کرتے ہوئے اعلےٰ جذبات اُبھارنے کی تحریک کی۔ اور بعدہٗ غلط فہمی کا شکار دیکھکر فلسفیانہ طور پر تمام مسائل رُوحانی کے عقدے کھول کر مختلف پہلوؤں سے بار بار یہ امر ذہن نشین کرایا۔ کہ تجھے یُدھ کرنا اور اپنا دھرم کرم کرتے ہوئے مرجانا بہتر ہے۔ بجائے اس امر کے کہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے۔ اور اسی طریق عمل کو اپنی خود کی خوشنودی کا باعث ہونے سے بھگتی کا سچا سروپ اور مہاراجہ جنک کی طرح برہم گیانی ہونے کا اعلےٰ ترین نمونہ ظاہر فرمایا۔ نیز یہ کہا۔ کہ نہ صرف پرماتمانے ہی اس سرشٹی کی رچنا کرکے بذات خود کرم کرنے کی تعلیم دی ہے بلکہ میں خود بھی اسی کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے عوام کی رہنمائی کیلئے عملی زندگی اختیار کرکے اس امر کی تصدیق کرتا ہوں۔ کہ کرم کرنا ہی انسان کے لئے بہترین راستہ ہے دیگر نہ صرف کرم چھوڑنے پر کسی قسم کی روحانی کامیابی (سدھی) ہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جسمانی ضروریات بھی پوری نہیں ہوسکتیں اور سوسائٹی کے نظام یعنے لوک سنگرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے؟ جسکو مدِ نظر رکھ کر تمام دُنیا کے مہاپرش کرم کرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں کرم چھوڑنے کا خیال بھی ایک قسم کا وہم ہی ہے۔ کیونکہ حواس اور خیال یا دل اور دماغ ہر وقت فطرتاً کام کرتے رہتے ہیں۔ گویا کوئی شخص ایک لحہ بھر کے لئے بھی کرم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ اپنے تئیں مختلف قسم کی طبعی یا ارادی حرکات کرنے سے روکنے کی کوشش کرنا بھی ایک قسم کا کرم ہی ہو جاتا ہے۔ اس لئے اکثر صورتوں میں کرم اور اکرم کی حقیقت سمجھنے میں بڑے بڑے دانا بھی حیرت میں آجاتے ہیں۔ پس اس کے پھل کے خیال کو چھوڑنا ہی سنیاس کا اصلی مفہوم سمجھ کر ہر شخص کو اپنا فرض یعنے مقررہ کرم پورا کرتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ

جہاں ایک طرف جنم کا بندھن (طبعی ضروریات کی پابندی) اس طریق عمل سے کٹ جائے گا۔ وہاں دوسری طرف کرم کا بندھن (عادت کی پابندی) بھی عامل کو پابزنجیر نہ کر سکے گا۔ اور اس طرح پر انسان کمل کے پتے کی طرح جیون مُکت ہو کر معراج زندگی کی بہار دیکھے گا۔

غرضیکہ ہر پہلو سے عملی زندگی کی فضیلت ظاہر کرتے ہوئے ارجن کو کرم کرنے کی تحریک کرنا ہی اس تعلیم کی غرض وغایت تھی۔

دوسری بات یہ ہے۔ کہ اس کا نتیجہ بھی کرم کرنے کی صورت میں ہی ظاہر ہوا۔ کیونکہ وہی ارجن جو پیشتر لسپت ہمت ہو کر لڑنے سے مُنہ موڑ چکا تھا۔ گیتا کی تعلیم پانے کے بعد کمربستہ ہو کر ایسا لڑا۔ کہ مخالفین کے چھکے چھڑا دیئے اور مہاراجہ یدھشٹر کی فتحمندی کا موجب ہوا۔ پس ایسی تعلیم کو کرم کی مخالف کہنا وہی معنے رکھتا ہے۔ جیسا کہ سورج کو منبع تاریکی بیان کرنا علاوہ ازیں ستوگنی کرم کی تعریف اور تعلیم دیتی ہے۔ نیز اسی اصول کو واضح کرنے کے خیال سے بھگوان نے یگیہ کی عظمت پر خاص زور دیا ہے اور ہر قسم کے عمل وعلم کو اس عنوان میں مختلف نام دے کر (مثلاً دربیہ یگیہ تپ یگیہ اور گیان یگیہ وغیرہ) ارجن کو کرم کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

(۲) **بھگتی یوگ** اگرچہ اعصاب حس وحرکت کی بنا پر حواس علمی و عملی کی ظاہری تفریق کو دیکھتے ہوئے ان کے عمل کی صورت میں قوت آگاہی کے اندر یا باہر کی طرف رُخ رکھنے کے لحاظ سے گیتا میں گیان اور کرم کے نام سے حصول معراج کے دو راستے (نشٹھا) ہی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن چونکہ نہ صرف ہر قسم کے اعمال کے لئے محرک کا کام ہی جذبات دیتے ہیں۔ بلکہ ہر دو صورتوں میں کامیابی کا حصول

٭ گیان کو کرم کا محرک (کرم جودنا) بیان کرنا بھی یہی واضح کرتا ہے۔ (سمتتا کرم یوگ کی)

بھی اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے۔ جبکہ سچا شوق اور استقلال شامل حال ہو
جس کا تعلق دل سے ہے۔ اس لئے خاص طور پر گیتا کے دل یعنے درمیانی حصے
میں بھی بھگتی کا مضمون ہی نمایاں صورت میں موجود پایا جاتا ہے۔ حتےٰ کہ بارہویں
ادھیائے کا تو نام ہی بھگتی یوگ ہے۔ اس کے علاوہ نہ صرف دوسرے ادھیائے
(شلوک ۶۱) میں ہی بھگتی کا اشارہ ملتا ہے بلکہ اٹھارویں ادھیائے (شلوک ۶۶) میں
بصورت مخفی ترین راز کے جو تعلیم دی گئی ہے وہ بھی درحقیقت اسی مفہوم کی
مظہر ہے۔ اس لئے اکثر اصحاب رامانج آچاریہ یا ولبھاچاریہ وغیرہ کی طرح گیتا کی
تعلیم کا جوہر ہی بھگتی یوگ خیال کرنے لگ گئے ہیں۔ لیکن بغیر کسی قسم کے
سمپردائے سمبندھ یعنے فرقہ بندی کے تعلق کے دیکھنے والا شخص بھی اس
امر سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ گیان اور کرم کی تعلیم کے ساتھ ہی اس میں بھگتی
کی تعلیم موجود ضرور ہے بلکہ ویکت اور اویکت یعنے ساکار اور نراکار ہر دو صورتوں
سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کا عنصر ان دونو کے برابر کہا جائے۔ تو بیجا
نہ ہوگا ۔

ممکن ہے کہ نرگن اور سگن کے الفاظ پر جھگڑا کرنے والے اشخاص بھگوان کے
لفظ "میں" کے مفہوم پر جو کہ مختلف[علے] معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ متفق الرائے
نہ ہوں۔ اور اپنے اپنے نقطۂ خیال سے کوئی اس سے کرشن کی مورتی یا اس کا

علے مثلاً کہیں تو کہا گیا ہے کہ میرے بہت سے جنم ہو چکے ہیں (جن سے لفظ میں کا
جسم سے تعلق ثابت ہوتا ہے) اور کہیں کہا گیا ہے۔ کہ میں تمام اشیاء عالم میں ہر جگہ ہی
موجود ہوں۔ جیسے مالا کے منکوں میں تاگا پرویا ہوتا ہے یہاں لفظ میں ذات حق کے
معنوں میں برتا گیا ہے علیٰ ہذا القیاس۔

کیریکٹر بڑھیے اور کوئی ویراٹ سروپ یا سونتر آتما خیال کرے ۔ (جن کا مفصل ذکر ہم
اپنی تصنیف "کرشن بھگتی کا تتو"، نامی چھوٹے سے رسالے اور فلسفۂ اتحاد
حصہ دوم میں بھگتی یوگ کے عنوان سے کر چکے ہیں) لیکن چونکہ ہمارے خیال
میں بھگتی سے اصلی مراد قوت جاذبہ کی ایسی نشوونما سے ہے ۔ جسکی بدولت
برخلاف عشق کے (جس میں عاشق معشوق کی طرف دیوانہ وار کشش پاتا
ہے) مطلوبہ شے بذات خود طالب کی طرف کھچی آتی ہے ۔ جیسے بھگوان رام
شبوری بھیلنی کی جھونپڑی میں پہنچ گئے تھے ۔ اور "بھگت کے بس میں ہیں بھگوان"
اس محاورے کی عملی تصدیق ہوتی ہے لمصداق ۔

ع خود را اگر لیلیٰ کناں آں یار را مجنوں کنم ؎

اس لئے بھگتی کا اطلاق بلحاظ انسان کی تمام خواہشات کے مطلوبہ شے
پر یکساں ہو سکتا ہے چنانچہ گیتا میں کہا بھی گیا ہے کہ جو کوئی جس کی بھگتی
کرتا ہے ۔ وہی اس کو حاصل ہو جاتا ہے ۔ دیوتاؤں کے بھگتوں کو تو
دیوتا مل جاتے ہیں ۔ اور جو میری بھگتی کرتے ہیں وہ مجھے پا لیتے ہیں"
نیز چار قسم کے بھگت بیان کرنا بھی اسی امر کا مظہر ہے کہ گیتا کے نقطۂ نگاہ
سے اس لفظ کا تعلق عالمگیر طور پر ہر شے سے باندھا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ
آرت بھگت اگر صحت بدنی کا طالب کہا جا سکتا ہے اور ارتھارتھی بھگت
دولت دنیا کا خواہشمند ہوتا ہے ۔ تو جگیاسو بھگت علمی کمال کی آرزو رکھتا
ہے ۔ اور گیانی بھگت لوک سنگرہ یعنے رفاہ عامہ کے کاروبار میں مصروف
رہتا ہے ۔ مطلب بہرحال یہ ہے ۔ کہ ہر شخص اپنی فطرتی استعداد کے بموجب
ساکار یا نراکار کی بھگتی میں حق بجانب کہا جا سکتا ہے ۔ ۹

جبکی ہوئی بھاونا جیسی ۔ ہری مورت تس دیکھی تیسی

علاوہ ازیں جو لوگ موجودہ سائیکالوجی پر عبور رکھتے ہیں ان کو گیلٹن صاحب
کے ذہنی تحقیقات کے نتائج سے بخوبی واقفیت ہوگی۔ کہ مختلف افراد
بلحاظ قوت باصرہ وسامعہ وغیرہ کی خصوصیت کے مختلف صورتوں میں
ہی تصور ذہنی بنا سکتے ہیں جنکو اصطلاحاً "Visualist" (جو کہ
چشم دید نظاروں کی صورت میں سوچ سکتا ہے) Audile
(جو کہ آواز کی صورت میں غور کر سکتا ہے) یا motor type
(جو کہ عضلاتی احساس کی صورت میں زیادہ اچھا نقشہ خیال باندھ سکتا
ہے) وغیرہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ Mixed type یعنی ایسے
اشخاص کثیر التعداد پائے جاتے ہیں۔ جن میں تمام حواس کا عمل تصور ذہنی بنانے
میں خاص حد تک معاون ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں ایک طرف ان کیلئے
مختلف پہلوؤں سے ایک ہی صداقت کا اظہار مفید مطلب ہو سکتا ہے
وہاں دوسری طرف اس طریقہ تعلیم پر وہ اصحاب بھی حصول مقصد سے
محروم نہیں رہ سکتے۔ جن میں کوئی خاص قوت ہی کار آمد ہو سکتی ہے
چنانچہ اس اصول کی بنا پر جو لوگ اعلیٰ درجے کی صداقت کے تصور کے
ساتھ ہی خاص اشکال کا نظارہ بھی ذہنی آنکھ کے سامنے موجود
پاتے ہیں۔ وہ تو فطرتاً ساکار اوپاسک کہے جا سکتے ہیں اور برخلاف
ان کے جو اصحاب ایبسٹریکٹ طریقے پر بغیر کسی شئے کا خیال کرنے کے
غور وفکر کر سکتے ہیں۔ وہ طبعی طور پر نراکار کے بھگت کہلا سکتے ہیں۔
علاوہ ازیں سائنس کا تعلق اگر ساکار اشیا سے ہے تو مذہب نراکار
پرماتما سے وابستہ پایا جاتا ہے۔ لہذا اس نقطہ خیال سے بھی گیتا کی تعلیم
عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔

دیگر جس طرح جسمانی قوت کے لحاظ سے سب آدمی برابر نہیں۔ ویسے ہی عقلی نوار کے لحاظ سے بھی سب افراد یکساں نہیں پائے جاتے۔ بلکہ بمقابلہ اعلےٰ درجے کے ذہین اصحاب کے جاہل لوگ بہت زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں اس لئے جس طرح بچوں کے لئے کنڈرگارٹن کا طریقہ تعلیم بہتر سمجھا گیا ہے ویسے ہی دہرم کا تتو عوام الناس کے ذہن نشین کرانے کے لئے بھگتی کو راج مارگ یعنے شاہی سڑک سے مشابہت دی گئی ہے۔ جس پر اندھا آدمی بھی لاٹھی کے سہارے آسانی سے چل سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں بجائے ادھیاتمک وچار یعنے فلسفیانہ باریکیوں پر دماغ سوزی کر کے وحدت روحانی محسوس کرنے کے صرف ایشور پرپشوامن کرنا یعنے ایک ایسی شکتی کے دھیان کرنے کی مشق کرنا ہی کافی ہے۔ جو کہ سروویاپک سروگیہ اور سرب شکتیمان ہوتی ہوئی ادنےٰ و اعلےٰ ہر ذی روح سے یکساں محبت کا سلوک کرتی اور ہر شخص کی طرف سے باہمدگر ایسے ہی سلوک کئے جانے کو پسند کرتی ہے۔ گویا جس طرح سورج یا چاند بلا تمیز اونچ نیچ کے سب کے گھروں پر یکساں روشنی کرتا ہے یا ہوا سب کے گھروں میں پہنچتی ہے۔ ویسے ہی وہ ذات مطلق عالمگیر طور پر بغیر کسی قسم کا ذاتی تعلق رکھنے کے سب کی بھلائی میں مصروف رہتی ہے اور ایسا سم درشٹی ہونے اور سب کی بہتری کی کوشش کرنے والے کو سچی شانتی کا معاوضہ دیتی ہے چونکہ طبعی اختلافات کے باعث ہر شخص کے لئے کسی ایک ہی صورت میں ایشور کا تصور قائم کرنا امر محال ہے۔ اس لئے اپنی ذاتی قابلیت اور دلچسپی کے لحاظ سے خواہ کوئی صورت (اشٹ دیو) کوئی پسند کرے بھگوان اسی راستے سے اسے مل جاتے ہیں۔ گویا جس طرح دریا کے

خیال سے کوئی فٹ بال یا کرکٹ کھیلنا پسند کرتا ہے اور کوئی کبڈی یا کشتی لڑنے کو ترجیح دیتا ہے کوئی مگدر اور موگری میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اور کوئی ڈمبل پھیرنے کو بہتر سمجھتا ہے۔ لیکن جسمانی قوت اور صحت حاصل کرنے میں ہر ایک سے فائدہ پہنچتا ہے۔ ویسے ہی خواہ کوئی ہاتھوں سے بنائے ہوئے بُت کا دھیان کرے یا ذہنی قوا سے تیار کئے ہوئے تصور کا مطلب ہر دو صورتوں میں یکساں ہے۔ ذات حق ہر حال میں یکساں جلوہ نما ہونے کے باوجود ان سے بالاتر رہتی ہے۔ بقول شاعر ؎

منزل جاناں زکفر و دیں بسے دور ست و دور ۔ ایں سخن بر کعبہ و بت خانہ بے باید نوشت

یہی بھگوت گیتا کی بھگتی کا تو ہے کہ تمام مذاہب کے طریق عمل کو اپنے راستے بیان کرکے بھی سب سے علیحدہ ہونے کو اپنا دھرم کہا گیا ہے گویا کسی سے دشمنی نہ رکھنا اور سب کی بہبودی کا طالب رہنا ہی راہ حق ہے۔ چونکہ ایسی رواداری اور مذہبی بردباری کا اصول جو کہ قومی اتحاد کی جڑ ہے سوائے بھگوت گیتا کے اور کسی مذہب کی مقدس کتاب میں واضح طور پر نہیں پایا جاتا۔ اس لئے اس پہلو سے بھی اس کا درجہ افضل ہے :

ماسوائے اس کے جسطرح حساب کا قاعدہ سمجھنے کے ناقابل ہونے پر اس کا گُر یاد رکھنے سے وہی مطلب حل ہو جاتا ہے اور کچھ عرصے کی مشق کے بعد وہ قاعدہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ ویسے ہی بھگوان نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ جہاں ایکطرف گیان کے طالب کو ستر دھا بھگتی کی ضرورت ہے وہاں دوسری طرف جو شخص ہر وقت میرے دھیان میں محو رہتا ہے۔ میں اس کو بدھی یوگ سے مستفیض کر دیتا ہوں۔ گویا بھگتی اعلٰے درجے کے اعمال کا محرک ہونے کے علاوہ گیان کا سادھن بھی بن جاتی ہے۔ لہذا ہر فرد بشر کے لئے ضروری ہے

کہ وہ بے ریائی اور دل کی صفائی سے اپنے تئیں ایشور کو سونپ دے اور اپنے ہر ایک عمل کو اسکے ارپن کر دے۔ ایسی حالت میں اس کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ وار بھی وہ خود ہی بن جاتا ہے۔ اس سے زیادہ حوصلہ افزا اور امید سے بھرپور تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟ مگر ضرورت محض اس امر کی ہے کہ بھگت اور بھگونت کے درمیان خودی یا دوئی کی صورت میں کوئی پردہ نہیں رہنا چاہئیے۔ کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے بدترین گنہگار بھی ویسے ہی اعلےٰ ترین دھرماتما بن جاتا ہے۔ جیسے کالا کوئلہ آگ میں پڑ کر نور مجسم ہو جاتا ہے۔ کیا ہی خوب کہا ہے کہ ہے ارجن! میری شرن میں آنے سے عورت ہو یا مرد۔ شودر ہو یا دوج نیک ہو یا بد سب کو یکساں پرم گتی حاصل ہو جاتی ہے۔ گویا گیتا محض نیک اعمال پر ہی مکتی کی امید نہیں دلاتی۔ بلکہ "ہنت پاون"، کی حیثیت سے معمولی انسان کے لئے خالص نیکی کے عمل کو ناممکن دیکھتے ہوئے (مسیح کے ظہور سے صدیوں پیشتر) اس کے گناہوں کے بوجھ اٹھانے کا بھی دعوے یاد دلاتی ہے۔ بشرطیکہ انسان سچے دل سے بھگوان کے رنگ میں ڈوبا رہے۔ بمصداق جب میں تھا تب ہری نہیں اب ہری ہیں میں نا ہند۔ پریم گلی اتی سانکری تا میں دو نہ سمانہہ

(۳) گیان یوگ

اگرچہ جس طرح سوامی دیانند جی کی نسبت روایت ہے کہ ان کے گورو سوامی ورجانند جی نے اپنی تعلیم دینے سے پیشتر انہیں اپنی پہلی پڑھی ہوئی پستکیں جمنا میں ڈبو آنے کے لئے ارشاد فرمایا تھا۔ اسی طرح گیتا میں بھی خلاف حقیقت اور جزوی تعلیم کو شیطانی خودی کا باعث ہونے کی وجہ سے نوگنی گیان کا نام دے کر اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ اور سنی سنائی باتوں (شرتی پران) پر یقین کرنے کو بمصداق "العلم حجاب الاکبر"، حصول صداقت میں ایک قسم کا پردہ ظاہر کیا گیا ہے اور اس صورت

میں بظاہر یہ گرنتھ گیان (وید) کی مذمت کرنے والا سمجھا جا سکتا ہے مصداق
علم را و عقل را و قال و قیل ۔ جملہ را انداختیم در آب نیل
اسم را و جسم را در باختیم ۔ تا کمال معرفت در یافتیم
لیکن درحقیقت جہاں ایک طرف اس میں تمام شاستروں کے بنیادی
اصولوں کی وحدت (سنوگنی گیان کی صورت) دکھائی گئی ہے وہاں دوسری
طرف دیگر مذاہب کے عقیدے کے بموجب (جو کہ اہل کتاب کہلانے کا فخر
رکھتے ہیں) یہ کتاب اپنی تسلیم پر محض ایمان لانے کی ہدایت نہیں کرتی
بلکہ عالمانہ طور پر معترض کے تمام شکوک کو معقول دلائل کے زور سے مٹاتی اور
ہر فرد بشر کے لئے اعلےٰ درجے کے گیان کا حاصل کرنا حصول معراج کیلئے
لازمی قرار دیتی ہے ۔ حتےٰ کہ سقراط کے مشہور عالم کلام (علم ہی نیکی ہے)
کے بموجب ہر قسم کے گناہ کو جلانے والی آگ علم حقیقی کو ہی بیان کرتی ہے ۔
نیز یہ کہتی ہے ۔ کہ "گیان کے برابر دنیا میں کوئی شے مقدس نہیں ہے ۔ اگر تم سب
گنہگاروں میں بڑھ کر بھی ہو ۔ تاہم گیان کی کشتی کے ذریعے اس بے ترنی ندی
یا سنسار ساگر سے پار ہو جاؤ گے" ۔ اور گیانی بھگت تو بھگوان کا ہی سروپ
بتلاتی ہے ۔ علاوہ ازیں اس اُپدیش کے خاتمے پر ارجن نے اس امر کی تصدیق
بھی کی ہے ۔ کہ "میری جہالت رفع ہو گئی ہے اور آپ کی عنایت سے میرے
شکوک دور ہو کر میری عقل ٹھکانے آ گئی ہے لہذا اب آپ کے فرمان کے
بموجب ہی عملدرآمد کروں گا" ۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ بھگوان کا یہ کہنا
بھی کہ "میں نے یہ مخفی سے بھی مخفی تر گیان تجھ سے کہا ہے اس پر بخوبی غور
کر کے جیسے تیری خواہش ہو ۔ ویسا کر" ہا اسی امر کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے ۔ کہ
ارجن پر زبردستی اپنی رائے کو ٹھونسا نہیں گیا ۔ بلکہ اس کو آزادانہ سوچنے کی تحریک

کی گئی ہے :۔

لیکن باوجود ایسی مدّھی یوگ پر زور دینے والی یعنی محققانہ تعلیم ہونے کے بھی بعض نکتہ چین یا سادہ لوح اصحاب کو گیتا بہت سے متضاد[1] بیانات کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے حالانکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ اس میں ویدا ور اوپنشدوں سے لے کر نہ صرف تمام شاستروں بلکہ پورانوں تک کے سدھانتوں میں بھی مطابقت دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ ویدوں کے یگیہ کا اصول۔

---

[1] ویدمیں اگر برہم کی نسبت متضاد اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ جیسے وہ متحرک ہے اور ساکن ہے دور ہے نزدیک ہے سب کے اندر ہے اور باہر ہے چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا ہے علیٰ ہذا القیاس۔ تو سائنس کے نقطۂ نگاہ سے مادہ بھی قوت اتصال وانفصال نامی دو متضاد خواص سے موصوف کہا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ دوئی محض نمائشی ہی ہے اصلی نہیں۔ بمصداق

دن شب کا جھگڑا ایک دیکھا گو سورج کا چپا سر ہے۔ جب کھلتی دیدہ روشن ہے ہنگامہ خواب کہاں پہونچے ہے

علاوہ ازیں بقول ایک مغربی فلاسفر کے اجتماع ضدین کا فیصلہ جس منطق کے اصولوں پر کیا جاتا ہے وہ بصورت ریلوے انجن کے (جو کہ خاص لائن پر ہی چل سکتا ہے ہر طرف نہیں) انہی خود ساختہ قوانین پر نتیجہ خیز ہوتا ہے جو کہ پہلے اس کے اندر محدود کر دئیے گئے ہوں۔ درحقیقت کوئی نئی صداقت نہیں دریافت کر سکتا۔ اور اُس آزادی کا مخالف ثابت ہوتا ہے۔ جس پر ایجاد و اختراع یا روحانی سچائیوں کا انحصار ہے لہذا وہ محقق جو کہ روحانی واقعات کو (جو اپنے خاص طریقے پر ہی محسوس ہو سکتے ہیں) مسلمہ منطق سے ہی حل کرنا چاہتا ہے وہ بد اصل اس شکاری کی طرح ہے۔ جو لومڑی کے شکار کیلئے بجائے گھوڑے کے انجن کی سواری کرتا ہے +

اوپنشدوں کا ادویت برھم کا فلسفہ۔ سانکھ کا پرکرتی کے گنوں کا کھیل تماشا یوگ کا چت ورتیوں کا نرودھ۔ سمرتیوں کا ورن دھرم۔ مہابھارت کا اتہاس اور پورانوں کا دلکش طرز بیان (جو کہ کرشن اور ارجن کے سمواد کی صورت میں نمایاں ہے) ایسی خوبی سے ہم آہنگ کیا گیا ہے گویا سات سوروں کے ملنے پر بھگوت گیتا اصلی معنوں میں نغمۂ ایزدی کی صورت بن گئی ہے یا سات رنگوں کے ملانے سے سورج کی روشنی کی طرح بے رنگ ذات کے نور کا ظہور کر رہی ہے لیکن جس طرح بعض اصحاب خاص رنگوں کے دیکھنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ ویسے ہی جن لوگوں کی ذہنی آنکھ خاص قسم کی غلط تعلیم یا فطرتی تعصب کی بدولت صحیح طور پر تبصرہ نہیں کر سکتی۔ وہ اس میں وضاحت اور صاف بیانی ہونے پر بھی (جو کہ ارجن کی طرف سے تیسرے ادھیائے کے شروع میں ہی اسی قسم کے اعتراض کئے جانے کا نتیجہ کہی جا سکتی ہے) صفائی سے صداقت حقیقی کو دیکھنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس سے گیتا کی تعلیم میں کچھ نقص نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ بلکہ معترضین کی سرشت کو ہی ناقص کہنے کا تقاضا کرتا ہے۔ بقول سعدی۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ۔ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

درانحالیکہ نہ صرف مختلف عقائد سے تعلق رکھنے والے مشرقی محقق ہی بلکہ مغربی فلاسفر بھی اس کی عالمگیر صداقت کی داد دے کر اس پر پسندیدگی کی مہر لگانے اور مقبول عالم ہونے کا فتوے دیتے ہوں ؛

دیگر امر یہ ہے کہ جہاں ایک طرف مادی نقطۂ نگاہ سے اس میں کشر اور اکشر و دیا یعنے فانی صورتوں میں ذات باقی کی تحقیق بالتفصیل کی گئی ہے۔

وہاں دوسری طرف[1] کشیتر اور کشیترگیہ گیان یعنے جسم و جان کی تشریح کرنے کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کی حقیقی وحدت دکھا کر علوم ظاہری و باطنی کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ نیز چونکہ نہ صرف جابجا گیتا میں تتو درشی اور پنڈت یا رشی منی وغیرہ عالم و عامل اصحاب کے نام سے ہی مختلف مسائل کی حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے بلکہ اس کے مطالعہ کو بھی گیان یگیہ (جو کہ دیگر ہر قسم کے یگیہ سے افضل کہا گیا ہے) کا نام دیا گیا ہے اس لئے علمی نقطہ نگاہ سے دہرم کا تتو سمجھانے والا اس سے بہتر اور کوئی گرنتھ نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن جیسا کہ بھگوان نے فرمایا ہے۔ کہ علم حقیقی کا حصول تتو درشی علما سے تبھی ہو سکتا ہے جبکہ طالب علم شردھا بھاؤ اور سیوا بھاؤ کو اپنے دل میں رکھتے ہوئے ان سے سوال کرے ویسے ہی بھگوت گیتا کے مطالعہ سے فیضیاب ہونے کے لئے بھی ضروری ہے۔ کہ جگیاسو عیب بینی کے نقص سے خالی اور شردھا بھگتی کے جذبات سے مزین ہو (ا - ۱۸ / ش - ۱۷) اور برخلاف اس کے جو شخص تپ یا بھگتی اور سننے کی خواہش سے خالی

---

[1] انہی دونو قسم کے مضامین کو وید کے انگوں کی اصطلاح میں اگر جیوتش اور کلپ دویا کا نام دیا جا سکتا ہے۔ (جیسا کہ فلسفہ اعتدال حصہ چہارم اور فلسفہ اتحاد حصہ سوم میں واضح کیا جا چکا ہے) تو سائنس کے نقطۂ نگاہ سے یہی دونو امور فزکس اور میٹافزکس کے نام سے موسوم کئے جا سکتے ہیں اور گیتا کے لفظوں میں انہی کو سانکھ اور یوگ کا نام دیا گیا ہے مطلب مختصر یہ ہے کہ برہمانڈ اور پنڈ یا پرکرتی اور پورش کی تحقیقات سے آخر ایک ہی حقیقی ہستی ثابت ہوتی ہے۔

ہو۔ اور بھگوان کرشن کی مذمت کرنے والا ہو۔ اس کو تو اس کا سنانا بھی منع ہے کیونکہ جس طرح کسی کمزور اور مریض شخص کو مرغن اغذیات بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتی ہیں یا کسی ابتدائی جماعت کے طالبعلم کو بی۔ اے یا ایم۔ اے کے کورس کا سنانا محض تضیع اوقات کا باعث ہوتا ہے۔ ویسے ہی بغیر ادھکاری یعنی مستحق شخص کے گیتا کا پڑھانا بے فائدہ کہا جا سکتا ہے۔ ؎

کہیں تیر نظر سے دل نہ ہو جائے ہدف دیکھو ۔ کلیجہ تھام لو پہلے تو پھر میری طرف دیکھو

المختصر بلحاظ موجودگی عظمت سروپا اور ادھکار وغیرہ کے گیتا میں گیان کا جزو اس حد تک پایا جاتا ہے کہ سوامی شنکر آچاریہ جیسے ودوان بھی بجائے کرم یوگ شاستر سمجھنے کے اسے محض گیان یوگ شاستر ہی سمجھ بیٹھے۔ اور موجودہ زمانے کے بہت سے ویدانتی تو ایک معنوں میں اس کو "تتوَمسی" نامی مہاواک (اسم اعظم) کی تشریح ہی خیال کرتے ہیں۔ جنہیں پہلے چھ ادھیائے اگر "توم" پد کی حقیقت کھولتے ہیں تو درمیانی چھ ادھیائے "تت" پد کی تفسیر کرتے ہیں اور آخری چھ ادھیائے میں ان دونو کا باہمی وحدت کا تعلق دکھا کر "اسی" پد کی تحقیق کی گئی ہے۔ گویا جیو برہم کی ایکتا ہی ذہن نشین کرانا اس سارے اپدیش کا تتو ہے۔ جس سے کثرت میں وحدت اور وحدت سے کثرت ہونے کا اصول سمجھ میں آجائے۔ لیکن بغور دیکھنے والے جانتے ہیں۔ کہ یہ خیال ویسا ہی غلط فہمی کا مظہر ہے۔ جیسے ساری گیتا کو محض بھگتی یا کرم یوگ شاستر خیال کرنا کیونکہ درحقیقت اس میں اٹھارہ ادھیائے ہی مختلف قسم کے یوگ کے نام سے پائے جاتے ہیں۔ جس سے اس کا یوگ شاستر ہونا ہی سدھ ہوتا ہے ؎

یوگ شاستر

جس طرح مشین صرف پرزوں کے مجموعے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ ان کو خاص ترتیب سے جوڑنے کا بھی تقاضا کرتی ہے

یا قوم محض لاکھوں افراد کے اکٹھا ہونے کو ہی نہیں کہتے۔ بلکہ ان میں خاص نظام یا سنگھٹن کا ہونا بھی ضروری ہے ویسے ہی دھرم کے مذکورہ بالا تین عناصر کا حال ہے گویا جب تک ان میں خاص قسم کی مطابقت نہ ہو اس وقت تک ان کا حامل برائے نام دھرم کا عامل تو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت دھرم اس سے اتنا ہی دور ہوتا ہے۔ جتنا کہ مردہ شخص سے اس کی روح۔ لہذا اصلی معنوں میں ان کو زندہ دھرم کا روپ دینے والا ایک چوتھا عنصر ہے۔ جسے یوگ کہتے ہیں اور درحقیقت یہی گیتا کا اصلی مضمون ہے۔ کیونکہ اگرچہ کرم بھگتی اور گیان کے مضامین بھی گیتا میں بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں اور بقول بعض اصحاب کے تو یہی اس کے ہر چھ ادھیائے کے تین حصوں سے بالترتیب تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن دراصل جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے ان کا علیحدہ علیحدہ حصوں میں ذکر نہیں آتا۔ بلکہ جس طرح حلوا یعنے موہن بھوگ اپنے ہر ایک حصے میں سوجی گھی، اور میٹھا شامل رکھتا ہے یا جس طرح انسان کے ہر ایک عضو میں خون اور اعصاب حس و حرکت کی موجودگی پائی جاتی ہے۔ ویسے ہی گیتا میں بھی ان ہر سہ عناصر کا جوڑ یعنے یوگ ہی نمایاں حیثیت رکھتا ہے ورنہ ان کا توڑ (انیلے سس) کسی شے کے رنگ شکل اور وزن کی طرح محض عالم خیال میں ہی کیا جا سکتا ہے واقعی نہیں۔ چنانچہ اسی لئے جہاں ایک طرف گیتا کے ہر ایک ادھیائے کو خاص قسم کے یوگ کا نام دیا گیا ہے اور بھگوان کرشن کو یوگیشور کے لقب سے بیان کیا گیا ہے وہاں دوسری طرف ارجن کو بھی نہ صرف ہر وقت یوگ یکت رہنے یا یوگ میں قرار پذیر ہو کر کرم کرنے یا یوگی بننے کی ہی واضح الفاظ میں ہدایت کی گئی ہے۔ بلکہ یوگ کو بمقابلہ جزدی حیثیت میں کرم تپ اور گیان ہر سہ امور کے افضل تر بھی بتلایا گیا ہے۔ لیکن بدیں خیال کہ غلط فہمی

کی بدولت یوگی سے مراد ایسے آدمی سے نہ لی جاوے۔ جو کہ کھانے پہننے وغیرہ جسمانی ضروریات سے لاپرواہ ہو کر پاگل اشخاص کی طرح مہینوں تک بیہوشی کے عالم میں پڑا رہے۔ بھگوان نے صاف الفاظ میں بتلا دیا ہے۔ کہ یوگ حد سے زیادہ کھانے یا بالکل نہ کھانے۔ یا بہت دیر تک سویا رہنے یا لگاتار جاگنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اہار وہار میں اعتدال رکھنے اور زندگی کے کاروبار میں عقل سے کام لینے اور سونے جاگنے میں یکتی یوریک رہنے سے ہی دکھوں کو دور کرنے والا یوگ حاصل ہوتا ہے اور اعلےٰ ترین یوگی وہی ہے۔ جو کہ سب جیانداروں کے سکھ دُکھ کو اپنی ذات کی طرح محسوس کرتا اور سم درشٹی ہوتا ہے۔ وہی یوگی اس اعلےٰ درجے کی راحت کو حاصل کرتا ہے۔ جو کہ حواس سے بالاتر اور محض عقل سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ (ادھیائے ۶ شلوک ۱۶ تا ۳۲)

اسی یوگ کی حالت پیدا کرنے کے لئے جسمیں خیالات جذبات اور خواہشات ایسی ہم آہنگ ہو جائیں۔ کہ ذہنی کشمکش بالکل معدوم ہو کر وحدت روحانی جلوہ نما ہو۔ بہترین سادھن ابھیاس[عـــہ] اور ویراگ کے نام سے بیان کئے گئے ہیں جو کہ نہ صرف مہرشی پاتنجل کے یوگ درشن میں ہی تسلیم کئے جا چکے ہیں۔ بلکہ مغربی علماء نفسیات کی طرف سے بھی ہر قسم کی تعلیم کے بنیادی اصول مانے جاتے ہیں۔ کیونکہ ابھیاس سے مراد شغل مشق یا ورزش سے ہے۔ جسکی بدولت ہر قسم کی قوائے ترقی پاتی ہیں اور ویراگ سے مطلب ترک تعلق یعنے لاپرواہی یا کسی طاقت کو کام میں نہ لانے سے ہے۔ جسکی بدولت بیکار عضو کی طرح وہ نابود ہو جاتی ہے۔ چونکہ سرشت انسانی میں دونو قسم کے نقائص طبعی طور پر موجود پائے جاتے ہیں۔ یعنے اعلےٰ درجے کے کئی خواص بہت کمزور ہیں اور ادنےٰ درجے کے کئی وصف حد سے بڑھے

عـــہ ان کی مفصل تشریح کے لئے دیکھو فلسفہ اعتدال حصہ اول ؛

ہوئے ہیں ۔ اس لئے ہر دو پہلوؤں کو درست کرکے آتمک اونتی کا کمال پانے
کے لئے اس سے بہتر اکسیر کا کام دینے والا اور کوئی نسخہ نہیں کہا جا
سکتا۔ چنانچہ اسی لئے کرم کرنے کی بہترین ترکیب کو ہی یوگ کا مفہوم حقیقی بیان
کیا گیا ہے ۔

چونکہ یوگ کی حقیقت اور اس کے وسائل کا مفصل ذکر فلسفہ اعتدال
اور فلسفہ اتحاد میں کیا جا چکا ہے۔ اس لئے عملی طور پر یوگی بننے اور اس
کے طریقے جاننے کے شائقین ان کتابوں کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتے
ہیں ۔

بہرحال جس طرح کسی مسافر کے لئے صرف منزل مقصود اور اس
کا صحیح راستہ جاننا ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پر چلنا اور حصول مدعا
تک استقلال طبع کو ہاتھ سے نہ دینا بھی لازمی امور ہیں ۔ ویسے ہی ہر قسم
کی کامیابی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان اپنے جسم دل و دماغ اور
ارادہ سے تعلق رکھنے والے کرم بھگتی گیان اور یوگ نامی چاروں اوصاف
اعلٰے سے موصوف ہو۔ اس لئے خواہ بیوہارک پہلو سے دیکھیں یا پرمارتھک
پہلو سے ۔ گیتا کی تعلیم نہ صرف اپنے وقت کے لئے ہی موزوں ترین
تھی ۔ بلکہ موجودہ اور آئندہ زمانے کے لئے بھی ویسی ہی بہترین کہلانے کی
مستحق ہے۔ جیسی کہ کوئی بھی خدائی کلام ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ یہی خوبی ہے
جسکی بدولت اس کا مصنف سولہ کلا سمپورن اوتار کہا جاتا ہے ۔

پرم گتی یا معراج اشرف

چونکہ مختلف محققین اور بانیان مذاہب
کی طرف سے اعلٰے ترین معراج انسانی
کو بہشت و نجات یا نروان اور موکش وغیرہ کی صورت میں مختلف نام

اور روپ دئے گئے ہیں۔ اس لئے اس امر کا اظہار از بس ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ یوگ میں کمال حاصل کرنے پر جو درجہ ملتا ہے گیتا اس کو کس نام سے موسوم کرتی ہے؟ اور صاحب کمال کے کیا خواص بتلاتی ہے؟ یعنے عام لوگوں کے مقابلے میں اس کا چال چلن کیا خوبی رکھتا ہے؟

اگرچہ اس سوال کا مفصل جواب تو گیتا کے دوسرے ادھیائے میں ستھت پرگیہ (قائم العقل) کے نام سے دیا جا چکا ہے۔ اور تقریباً ایسا ہی بارھویں ادھیائے میں "بھگتی مان" یا بھگوت بھگت کے نام سے اور چودھویں ادھیائے میں ترگنا تیت کی اصطلاح سے دیا گیا ہے لیکن علاوہ ان تین الفاظ کے تقریباً تمام وہ الفاظ یا القاب بھی اس صاحب کمال کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ جو کہ گذشتہ ایام میں کسی پہلو سے بھی کسی عامل کامل کو دئے جاتے تھے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل قابل غور ہیں۔

پنڈت و دھیر - تتو درشی - رشی - منی - یوگی - یتی - مکت گپت سنیمی یشکھی - شانت - بدھیمان سنیاسی تیاگی - برھم میں ستھیتی والا - برہم نروان یا برھم بھوت - سم درشی - پرشوتم - بھدیہ مہاتما - گیانی - یوگیشور وغیرہ وغیرہ

گویا ہر ایک اعلےٰ ترین وصف جو کہ جسمانی نفسانی عقلی اور اخلاقی صحت سے تعلق رکھتا ہے وہ برھم گیانی یوگی میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی سر رشتہ پورش کی تقلید کے خیال سے کسی شاعر نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ہدایت عامہ کا اصول قلمبند فرمایا ہے ؎

وہ چال چل کہ عمر خوشی سے کٹے تری - وہ کام کر کہ یاد تجھے سب کیا کریں
جس جا پہ تیرا ذکر ہو ہو ذکر خیر ہی - اور نام تیرا لیں تو ادب سے لیا کریں

الغرض یہی یوگ رُوپی دہرم امرت ہے۔ جوکہ انسان کے کمال پانے یا محبوب الہٰی بننے کے لئے گیتا ایک لازمی شرط قرار دیتی ہے۔ اور اسی پیغام کا دوسرے شائقین تک پہنچانا بھگوان کی پرم بھگتی یعنے رُوح القدس کے ظہور کا مترادف بیان کرتی ہے۔ نیز یہی دہرم ہے۔ جس کے عملی زندگی میں اختیار کرنے پر مختار ہونا یعنے طبعی اور عادتی مجبوریوں سے (جنہیں اصطلاحاً جنم بندھ اور کرم بندھ کا نام دیا گیا ہے) آزادی پانا نجات کا مفہوم حقیقی بتلاتی ہے۔ گویا مکتی کے لئے مرنے کے بعد کا وعدہ نہیں کرتی۔ بلکہ اسی زندگی میں اس کا لطف اُٹھانے اور جیون مُکت بنانے کا راز ذہن نشین کراتی ہے ؞

چونکہ نجات یعنے مکتی کے بارے میں کئی قسم کی غلط فہمی کی وجہ سے جوکہ ان مختلف تصوریوں پر انحصار رکھتی ہے۔ جو سرشٹی کی رچنا اور جیو آتما کی حقیقت یا پرماتما کی ہستی کے متعلق نیائے سانکھ اور ویدانت وغیرہ کے نقطۂ نگاہ سے پیش کی گئی ہیں۔ اختلاف رائے عام ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے سچے سروپ پر قدرے وضاحت سے روشنی ڈالی جائے۔

مُکتی کا سچا سروپ

اگرچہ عام طور پر مکتی کو انسانی زندگی کا مقصد اعظم یعنے پرم پُرشارتھ کہا جاتا ہے کیونکہ مقاصد انسانی (دہرم ارتھ کام موکش) میں اس کا درجہ چوتھا یعنے سب سے آخری ہے۔ لیکن حقیقت حال سے بیخبری کی بدولت عوام الناس تو درکنار اچھے اچھے سمجھدار اور تعلیمیافتہ اصحاب میں بھی اس کے متعلق نہایت عجیب و غریب تصورات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف اگر پورانک نقطۂ نگاہ سے سالوک۔ سامیپ۔ سارُوپ اور سایُج کی صورتوں یہ چار قسم کی بیان کی جاتی ہے۔ رجن کی حقیقت فلسفہ اعتدال کے چوتھے حصے میں بالتشریح

بیان کی جا چکی ہے) تو دوسری طرف دارشنک نقطہ نگاہ سے بھی اسکی چار اقسام
ہی پائی جاتی ہیں۔ اول وہ جس میں امرت پراپتی کے نام سے دائمی زندگی کو مکتی
خیال کیا جاتا ہے۔ اور موت سے چھوٹ جانا اس کا مفہوم قرار دیا جاتا ہے۔
دوم وہ جس میں پرمانند کی پراپتی کے نام سے دائمی راحت یا جنت نصیب ہونے
کو مکتی سمجھا جاتا ہے۔ اور تینوں قسم کے دکھوں سے رہائی پانا اس سے مراد
لی جاتی ہے سوم وہ جس میں برہم گیان یعنے علم حقیقی کے حصول پر ذات مطلق
سے یکتا ہونے کو مکتی ؀ تصور کیا جاتا ہے اور ہر قسم کے توہمات یا اودیا سے
چھوٹ جانا اس کا مطلب سمجھا جاتا ہے۔ چہارم۔ وہ جس میں خیر مجسم بننے
اور شر یعنے بدی یا پاپ سے چھوٹ جانے کو مکتی کا مفہوم حقیقی یقین کیا
جاتا ہے ؀

لیکن درحقیقت یہ چاروں امور آتمک جیون کے جزوی یا یکطرفہ تصورات
کے ہی مظہر ہیں۔ جس کا مکمل سروپ سرشت انسانی کے چاروں عناصر یعنے جسم
دل دماغ اور ارادے کی صحت کے نام سے سچدانند مکت کی صورت میں فلسفہ
اتحاد حصہ اول میں بالتفصیل بیان کیا جا چکا ہے ؀ ایسے ہی بعض اصحاب اگر
آواگون یا تناسخ کے چکر سے چھوٹ جانا یعنے نروان پانا ہی مکتی کا مترادف
خیال کرتے ہیں۔ تو بعض کی رائے عالی ہیں قومی آزادی یا سوراجیہ پراپتی ہی اس
کا اصلی سروپ ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے۔ تو بھگوت گیتا کے نقطہ نگاہ
سے جسم زندگی۔ راحت صداقت اور دھرم کی حقیقت کا بالترتیب انکشاف
کرنے کے بعد "ستھت پرگیہ" کے نام سے جیون مکت کے اوصاف کا بالتفصیل بیان
کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا تمام قیاسات خاص قسم کی غلط فہمی پر ہی مبنی پائے جاتے
ہیں۔ چنانچہ اس راز اکبر کو سمجھنے کے لئے بھی چار سوالات ہی غور طلب ہیں

(۱) مکتی کا تعلق دیہہ یعنے جسم سے ہے یا کہ دیہی یعنے آتما سے؟ چونکہ گیتا میں آتما کو بمقابلہ تغیر پذیر جسم کے لاتغیر کہا گیا ہے اور ننیہ۔ سروگت۔ سنفانو اچنیتیہ اور اوکار وغیرہ صفات سے متصف ہستی قرار دیا گیا ہے۔ جس پر آگ پانی وغیرہ کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بلا تکلف کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس طرح حروف یعنے اکشر خواہ دہرم گرنتھوں میں استعمال ہوں۔ یا کوک شاستر میں۔ لیکن نفس مضمون کے پاک یا فحش اثر سے بالاتر رہتے ہیں۔ ویسے ہی بندھ اور موکش کے متضاد خواص بھی تغیر پذیر مادی ظہورات سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اکشر آتما سے نہیں؛

(۲) مکتی کا تعلق بھوگ شکتی (حس) سے ہے یا کرم شکتی (حرکت) سے؟

چونکہ مکتی کے معنے آزادی اور بندھ کے معنے قید یا مجبوری کے ہیں۔ اس لئے یہ دونو متضاد حالتیں دوئی کی حدود میں ہونے سے نہ صرف سردی گرمی یا سکھ دکھ کی طرح نرگنا تمک پرکرتی سے تعلق رکھنے والی یعنے مادی صورتوں سے ہی وابستہ ثابت ہوتی ہیں۔ بلکہ ان میں بھی اگر خط تمیز کھینچا جائے۔ تو جس طرح راگ کا تعلق کان سے اور رنگ کا تعلق آنکھ سے مشاہدے میں آتا ہے۔ ویسے ہی سکھ دکھ کا تعلق اگر بھوگ شکتی یعنے احساس اور جذبات نفسانی سے پایا جاتا ہے تو مجبوری اور آزادی کا تعلق کرم شکتی سے (جو کہ بصورت ارادہ عضلات بدنی اور قوا دماغی پر حکمران ہے) نظر آتا ہے۔ جس کی بدولت حسب منشا اعمال یا خیالات ظہور پذیر ہوتے ہیں؛

علاوہ ازیں چونکہ لفظ پُرشارتھ پرار بدھ کے بالمقابل وہی معنے رکھتا ہے جو کہ تقدیر کے بالمقابل تدبیر رکھتی ہے۔ جن میں سے اول الذکر کا تعلق اگر جسم

سے ہے تو آخرالذکر کا کرم سے۔ اس لئے پرم دہرم یا پرم پرشارتھ ہونے کی وجہ سے بھی مکتی کو قوت ارادی سے ہی منسوب کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے جہاں ایک طرف گیتا میں واضح طور پر کہا گیا ہے (ا ۵ س ۲۸-) کہ جو شخص حواس نفس اور عقل پر قابو رکھتا اور خواہش غصہ اور خوف کے جذبات سے ہمیشہ پاک رہتا ہے وہ مکت ہی ہے وہاں دوسری طرف سکھ منی صاحب میں گورو ارجن دیو نے بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں ہی مُکتی کی حقیقت ظاہر فرمائی ہے۔ سہ

جیسے سورن تیسے اس ماٹی ۔ جیسا امرت تیسی بکھ کھاٹی
جیسا مان تیسا اپمان ۔ جیسا رنک تیسا راجان
جو برتاوے سائی جگت ۔ نانک اوہ پورکھ کہئے جیون مکت

یعنے سونا مٹی امرت زہر عزت بےعزتی بھکاری اور راجا سب کو یکساں سمجھتا ہوا جو شخص راضی برضا رہتا یعنے احکام حق کی تعمیل کرنا زندگی بسر کرنے کی بہترین ترکیب (مکتی) سمجھتا ہے۔ وہی جیون مکت ہے۔ اسی اصول کو ذہن نشین کرانے کے لئے بھگوان کرشن نے کرم یوگی مہاراجہ جنک کی مثال پیش کی ہے جو کہ ہر قسم کا کاروبار سلطنت کرتے ہوئے بدیہہ مکت کہلاتے تھے۔ نہ کہ کسی ایسے شخص کی جو کہ عیش پرستی میں سب سے بڑھ کر ہوا ہے۔

(۳) مکتی کے مفہوم میں کن بندھنوں سے چھوٹنا شامل ہے؟

چونکہ آتما تو مرنے اور پیدا ہونے کی قیود سے بالاتر ہے اور جسم کیلئے پیدائش و موت لازمی امر ہے۔ اس لئے جیون مکتی کا لفظ ہی اس مفہوم کا مظہر ہے کہ موت اور پیدائش کو بندھن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ورنہ نہ صرف کوئی رشی منی بلکہ رام اور کرشن وغیرہ اوتار بھی نجات یافتہ یا مکت نہ کہے جا سکتے

البتہ پیدائش سے ہی خاص قسم کی جسمانی اور دماغی کمزوریاں یا بے آہنگیاں انسان کو صحیح اعمال کرنے میں ضرور سدِ راہ ہوتی ہیں۔ اس لئے اوّل تو یہی بندھن ہے۔ جس سے مکتی پانا انسان کی تمام کوششوں کی غرض وغایت ہونی چاہیئے۔ دیگر چونکہ خاص قسم کے اعمال کرنے یا خاص حالات میں رہنے سے انسان کو ایسی عادات بھی راہِ حق پر چلنے میں روکاوٹ بن جاتی ہے اور انسان ان کی بدولت اپنے تئیں ویسا ہی مجبور پاتا ہے۔ جیسا کہ پیدائشی کمزوریوں کی صورت میں تھا۔ اس لئے پہلے یعنے طبعی بندھن کو کاٹنے میں ہر قسم کی کوشش کرتے ہوئے ہر فرد بشر کو یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ بجائے آزاد ہونے کے وہ اپنے راستے میں کوئی دوسری قسم کا عادتی بندھن تو پیدا نہیں کر رہا۔ کیونکہ دھرم سے اصلی مراد ایسی طریقِ عمل سے ہے۔ جو کہ طبعی بندھنوں کو توڑنے میں مدد دے۔ نہ کہ نئے بندھن پیدا کرے۔ ورنہ وہی بظاہر دھرم کہلانے والا عمل درحقیقت ادھرم بن جاوے گا۔ جیسے بیماری کو دُور کرنے والی ادویات غلط طور پر استعمال کئے جانے کی صورت میں زہر کا کام کر جاتی ہیں۔ اس لئے حقیقی معنوں میں مکتی کا حصول اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان دونو قسم (طبیعت اور عادت) کی قیود سے آزاد ہو۔ جن کو کیفیت مجموعی پرکرتی کا نام دیا جاتا ہے اور گیتا میں جنم بندھ اور کرم بندھ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چنانچہ انہی فطرتی امراض کے علاج کی غرض سے "یوگ" کا نسخہ پیش کیا گیا ہے۔ جس کو ٹھیک طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے مختلف قسم کے زہد وریاضت کے عمل دیگر مذاہب کی تعلیم میں خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

۲۔ مکتی کے بنیادی اصول یا عناصر کون سے ہیں؟ چونکہ پہلی

مجبوری جسمانی اور دماغی کمزوری کی صورت میں پیش آتی ہے (جسے جنم بندھ
کا نام دیا گیا ہے) اس لئے مُکتی کا پہلا اصول بھی انہی دو نو قسم کی طاقت پیدا
کرنا کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے معراج اعلےٰ کی شائقین کو پہلا قدم برہمچریہ
آشرم میں داخل ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ جس کے دوران میں انسان کو جسمانی
اور دماغی قوا کو کمال پر پہنچانا پڑتا ہے اور مختلف قسم کے زہد و ریاضت
کی بدولت نفس پرستی کی عادات سے بچاؤ رہتا ہے ؛

لیکن جہاں طاقت کی عدم موجودگی غلامی یعنے تفریط آزادی کا موجب
ہوتی اور حصول حقوق کے راستے میں سدراہ بنتی ہے۔ وہاں محض طاقت
کا کمال پانا جذبۂ راحت پرستی کے ساتھ مل کر (جو کہ فطرتاً ہر شخص کے دل میں
مقیم پایا جاتا ہے) بدلگامی یعنے افراط آزادی کا باعث بن جاتا ہے۔ جس سے
وہ دوسروں کے حقوق میں زبردستی ہاتھ ڈالتا اور بجائے فرض شناسی
کے عیش پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یہی دو نو رذائل انسان کو حصول نجات
میں (جو کہ درحقیقت اعتدال آزادی کا نام ہے) روکاوٹ ثابت ہوتی ہیں
اس لئے اول الذکر ذلیلت سے بچنے کے لئے اگر طاقت[1] کا ہونا ضروری
ہے تو آخر الذکر نقص سے محفوظ رہنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ انسان دوسروں
کے سکھ دکھ کو بھی اپنے مانند دیکھنے کا عادی ہو۔ جسے اصطلاحاً
سم درشٹی ہونا کہتے ہیں اور جو درحقیقت سچی محبت یا ہمدردی کا ہی دوسرا
نام ہے۔ اس لئے یہی مکتی کا دوسرا عنصر کہا جا سکتا ہے۔ جس کا عملی سبق
سکھانے کے لئے گرہست آشرم میں داخل ہونا ہر فرد بشر کے لئے ایک

[1] چونکہ طبعی طور پر انسان بیرونی دنیا کی طرف میلان رکھتا ہے اور حیوانات کی طرح

(بقیہ صفحہ ۱۳۰ پر)

لازمی فرض قرار دیا گیا ہے انہی دونوں وسائل یعنی طاقت اور محبت کی بدولت

طاقت سے کام لینا موجب ترقی خیال کرتا ہے اس لئے تواریخ اور سائنس کا سبق سیکھنا اور باہمی جنگ کے تلخ تجربات سے امن پسند ہو کر محبت کے قانون کی پیروی کی عادت بنانا مقصد زندگی خیال کرتا ہے۔ لیکن گیتا کہتی ہے کہ گو امن اور محبت بہت اچھی چیز ہے۔ لیکن اتنی اچھی نہیں کہ ہر شے یعنی جان مال آبرو دہرم اور آزادئے خیال وغیرہ ہر شے کو اس پر قربان کر دیا جائے۔ اس لئے خاص حالات میں دوا کے طور پر جنگ بھی ضروری امر ہو جاتا ہے۔ لہذا آسری مایا کے بندھن سے تو نجات پانا ہی چاہیئے لیکن "دیوی مایا" کے بندھن کو بھی ایسا زیور نہ سمجھنا چاہیئے۔ جس سے جب چاہیں آزاد ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اس کا توڑنا بھی کچھ کم مشکل نہیں ہوتا۔ جب تک خاص ابھیاس نہ کیا جاوے۔ علاوہ ازیں چونکہ فطرتاً انسانی طبیعت نئی چیز کو پسند کرتی ہے۔ اس لئے نوجوان ہمیشہ بلحاظ علم و نیتن کے نئے خیالات کے دلدادہ ہوتے اور جنگ کو پسند کرتے ہیں۔ گویا ان میں جنم کا بندھن بالخصوص نمایاں ہوتا ہے لیکن برخلاف ان کے بوڑھوں میں پرانی باتوں سے زیادہ دلچسپی پائی جاتی ہے اور بلحاظ عقائد یا رسم و رواج کے وہ نئی تبدیلیوں سے متنفر دکھنے میں آتے اور محبت سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ گویا انہیں عادات کی پابندی یا کرم کا بندھن نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ انسانی کوششوں کی اصلی غرض و غایت طبعی مجبوریوں سے آزادی پانا ہے نہ کہ عادات کی قید میں گرفتار ہونا کیونکہ اکثر صورتوں میں بد سے بدتر کی طرف ترقی (تنزل) کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے اس لئے تمام مذاہب کی تعلیم میں ریاضت (ابھیاس و ویراگ) پر خاص زور دیا گیا ہے تاکہ انسان ہر حال میں خوش رہنا سیکھے۔ لیکن اسکے یہ معنے نہیں۔ کہ پاگلوں کی طرح کسی قسم کے اثرات کو محسوس ہی نہ کیا جائے یا اس کا مناسب جوابعمل نہ دکھایا جائے اور اپنی ذمہ داری اور فرائض سے لاپرواہی کا اظہار کیا جائے۔ بلکہ اصلی مطلب یہ ہے کہ حسب حالات کام کرتے میں کسی قسم کی طبعی یا عادتی روک ٹوک

انسان ظاہری اور باطنی غلامی سے آزاد رہ سکتا ہے یہی دونو امور سائنس[1] اور مذہب کی تعلیم کا نچوڑ کہے جا سکتے ہیں۔ جنمیں سے اول الذکر کی بدولت اگر بیرونی پرکرتی کی طاقتوں پر فتح پاکر پرماتما کی جلالی صورت کا ظہور ہوتا ہے۔ تو آخر الذکر کے ذریعے اندرونی پرکرتی کو قابو کر کے اس کے جمالی نظارے سے مستفیض ہوتا ہے۔ انہی کی مجموعی حالت پر لوک پرلوک کی بہبودی کا انحصار ہے۔ ایک طرف

---

[1] بعض اصحاب سدھیوں یا معجزے کا دھرم سے ایک لازمی تعلق خیال کرتے ہیں اور ان معنوں میں اسکو سائنس کا ضد مقابل قرار دیتے ہیں۔ لیکن گیتا کی تعلیم کی بنا پر چونکہ طبعیت یا عادت کے بندھنوں کا توڑنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ بذات خود طبائع اور عادات کے بننے اور بگڑنے کے اسباب سے واقفیت حاصل ہو۔ اس لیئے سچا دھرم اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ نہ صرف سائنس اسکی مخالفت کا ہی دم نہ بھرے۔ بلکہ مگیا سوفی یا لوجی اور سائیکالوجی وغیرہ سائنس کی مختلف شاخوں سے بخوبی واقف ہو۔ گویا دھرم شروع ہی وہاں سے ہوتا ہے۔ جہاں پر سائنس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے جہاں ایک طرف بھگوان نے گیتا میں بار بار گیان اور وگیان کی تشریح پر توجہ دلائی ہے۔ وہاں دوسری طرف اپنا گیان ہی اسے تسلیم کیا ہے۔ جو کہ کشیتر اور کشیترگیہ یعنے جسم اور روح سے تعلق رکھتا ہے۔ بہر حال سائنس اور دھرم میں اگر کوئی مخالفت ہے تو بس یہی کہ جہاں بغیر دھرم کے سائنس نفسانی خواہشات کی سیری کے سامان مہیا کرنے کا موقع دیتی۔ بالفاظ دیگر شیطانی سلطنت کا جلوہ دکھاتی ہے۔ وہاں دھرم کے زیر اثر آنے پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے یعنی رام راجیہ کا باعث ہوتی ہے۔ باقی رہا سوال سدھی یعنی کامیابی کا وہ یوگ کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے کیونکہ اسکی بدولت انسانی قواء بجائے باہمی مخالفت کے ایک دوسرے کی معاون ہوتی اور پوری طاقت کا فائدہ پہنچاتی ہیں۔

اگر ہر ایک بچے کے لئے اسکے پتا اور ماتا بالترتیب انہی عناصر کے نمائندہ کہے جا سکتے ہیں۔ تو دوسری طرف ہر ایک بھگوت بھگت کے لئے بھگوان کا سروشکتیمان اور پریم سروپ ماننا بھی انہی خوبیوں کو اختیار کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ چونکہ علم ایک زبردست طاقت ہے۔ اور عالمگیر محبت اس طاقت کا مصلح ہے۔ اس لئے انہی امور کو برہم گیان اور اشیور بھگتی کی صورت میں کرم کے ساتھ ملا کر مکتی کے لاثانی سادھن کی حثیت سے گیتا میں نشکام کرم کی تعلیم دی گئی ہے جو کہ نہ صرف تقسیم محنت کے لحاظ سے ہر ایک گرہستی اور سنیاسی کے لئے ہی موزوں ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ جگت گورو بھگوان کرشن کے سدرشن دھاری اور بنسی والا کہلانے کی وجہ سے (جو اوصاف کہ دراصل ان کے طاقت اور محبت مجسم ہونے پر دلالت کرتے ہیں) ان کے عملی جیون سے بھی مطابقت رکھتی ہے ؛

علاوہ ازیں چیتن آتما اگر کائنات میں طاقت کا منبع تسلیم کیا جاتا ہے۔ تو جڑ پرکرتی یعنے مادہ اپنی ذاتی خاصیت (کشش ثقل) سے محبت کا سبق سکھاتا ہے ؛ چونکہ دو اشخاص کے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے پر وہی کامیاب ہوتا ہے۔ جو کہ زیادہ طاقت رکھتا ہے۔ اس لئے جیون مکت کی حقیقی طاقت کا ثبوت بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف جو کوئی شخص اُسے دیکھے۔ اسکے حسن سیرت کا عاشق ہو کر خواہ مخواہ اس کی طرف کشش پائے۔ بلکہ بمقابلہ عام لوگوں کے جو کہ لذات محسوسات کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔ سنسارک وشئے بھی اس کی طرف ویسے ہی چلے آئیں۔ جیسے پروانے شمع کی طرف یا دریا سمندر کی طرف دوڑے آتے ہیں۔ ایک مہاتما کا کلام ہے۔ ؎

بھاگتی پھرتی تھی دُنیا جب طلب کرتے تھے ہم ۔ اب جو نفرت ہم نے کی وہ بیقرار آنے کو ہے

مطلب یہ کہ جس طرح سورج کی طرف منہ کرکے دوڑنے پر سایہ آدمی کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے ویسے ہی نجات یافتہ اس امر کا زندہ ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ حق پرست ہونے کی وجہ سے پرکرتی کے تمام اعلےٰ ظہور اس کے پیچھے پیچھے لگے پھرتے ہیں۔ یہی بھگوان وشنو کا اوتار ہونا یعنے لکشمی کا پتی بننا ہے۔ اسی نشکام بھاؤ کی پراپتی کو جو کہ لوک سنگرہ کا نہایت ضروری سادھن ہے۔ برہم میں قرار پذیر ہونا یا رُوح القدس کا مندر بننا کہا گیا ہے ؛

کیا یہ حیرانی کی بات نہیں۔ کہ اہل ہند ایسی جیون مکت بنانے والی گیتا کی تعلیم کو (جو کہ ارجن کی طرح ہر شخص کو بیخوف اور ہمدرد خلائق ہونے اور ادہرم کے برخلاف جنگجو سپاہی بننے کی ہدایت کرتی ہے) چھوڑ کر اہل مغرب کی ایجاد کردہ برائے نام "مکتی فوج" میں شامل ہونا باعث نجات خیال کریں؟ یا طبیعت اور عادت کی حقیقت کو سمجھے بغیر ان کے بندھنوں سے چھٹکارہ پانے کے لئے کسی چالاک "گورو" کی غلامی کا طوق پہننے کو باعث فخر سمجھیں؟ لیکن وجہ صاف ظاہر ہے۔ کہ گیتا کے مفسروں نے اس کے حقیقی مفہوم پر اپنی قابلیت کا ایسا پردہ ڈال دیا ہے۔ کہ اس کا اصلی رُوپ ہی بالکل اور کا اور نظر آنے لگ گیا ہے۔ پس ضرورت ہے کہ ہر شخص گیتا کے تتو کو خود سمجھ کر اور دوسروں کو سمجھا کر دوبارہ اس بھارت کو ویسا ہی جیون مکتوں کا دیش بنانے کا جتن کرے۔ جیسا کہ گزشتہ زمانے میں اس کا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ نیز ہر قسم کے رسم ورواج مجلسی۔ قوانین ملکی اور عقائد مذہبی کو حالات زمانہ کے ساتھ بدلنے والا سمجھکر فرقہ بندی کے جھگڑوں سے (جو کہ قدامت پرستی کی فطرتی مرض کا نتیجہ ہیں) بچتا ہُوا اس عالمگیر اصول کو اختیار کرنا ہی سناتن دہرم کا مفہوم حقیقی خیال کرے۔ جو کہ بھگوان کرشن نے

اپنی شیریں بیانی سے یوگ اور لوک سنگرہ کے طالب ہونے بالفاظ دیگر اعتدال اور اتحاد کی صورت میں ظاہر فرمایا ہے۔ جنکی مفصل تشریح ہم اپنی تصانیف فلسفہ اعتدال اور فلسفہ اتحاد میں کر چکے ہیں ؛

گیتا کی تعلیم کا نچوڑ

(۱) ادھکاری۔ بھگوت گیتا کی تعلیم اس شخص کے لئے ہے۔ جو کہ یہ محسوس کرتا ہے۔ کہ وہ دہرم کشیتر یعنے ایسے میدان میں بطور سپاہی کے کھڑا ہے جہاں ہر وقت اس کا بدی یا شیطان سے مقابلہ ہے (دیو اسر سنگرام) اور وہ بغیر آسمانی مدد کے کامیاب نہیں ہو سکتا ؛

(۲) تعلیم۔ گیتا بتلاتی ہے۔ کہ بھگوان کرشن آسمانی ہستی تھے جو کہ انسانی صورت میں جلوہ نما ہو کر اہل دُنیا کو مُکتی کی بشارت دینے اور آسمانی مدد پہنچانے آئے تھے۔ (۲) انکی تعلیم آسمانی بادشاہت یعنے دہرم کا راجیہ لانے اور ادہرم سے نجات دلانے کا بہترین وسیلہ ہے لہذا اس کا مطالعہ کرنا کامیابی کا زینہ ہے۔ (۳) سم درشٹی اور آتم یاجی ہونا یعنے مساوات اور خود انباری (جو کہ منوجی نے سوراجیہ کے سادھن بتلائے ہیں) بھگوان کرشن کے جیون اور تعلیم کا نچوڑ ہے انہی کے ذریعہ زمین پر آسمانی بادشاہت لائی اور شیطان پر فتح پائی جا سکتی ہے

؎ غریبتہا ہے کردم کہ شیطان ز طرف گرد۔ زیک بینی و یکدانی حصارے کردہ ام پیدا

(۴) ہر کرشن بھگت کا فرض ہے۔ کہ وہ خود پاپ سے مکتی حاصل کرنے اور دنیا کو بدی سے چھڑانے (لوک سنگرہ) کے لئے سپاہی کی طرح ہر وقت طیار رہے۔ اور دنیا کو دہرم کشیتر سمجھتا ہوا شیطانی طاقتوں کے مقابلے میں کبھی سر نہ جھکاوے یہی مستقل مزاجی کرشن بھگتی کا اصلی مفہوم ادا کرتی ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے

کہ جس غرض سے کرشن نے اوتار دھارن کیا تھا۔ اسی غرض کو پورا کرنے کے لئے اپنی زندگی کو قربان کرنا (آتم یگیہ) صحیح معنوں میں کرشن بھگت بننا ہے اور اسی طریق عمل سے اپنے من کو سندر بنایا جا سکتا ہے ؛

(۵) ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنا مخفی جوہر یعنے فطرتی قابلیت تلاش کرکے جس طرح ممکن ہو۔ دوسروں کی بہبود میں اس کا استعمال کرے خواہ وہ قوت خیال سے تعلق رکھتا ہو یا کلام اور اعمال سے۔ مثلاً اگر وہ نسبتاً زیادہ علم رکھتا ہے تو دوسروں کی غلط فہمی اور جہالت کو دور کرکے اس کا فائدہ پہنچا دے اگر دولت زیادہ رکھتا ہے تو کسی مصیبت زدوں کی امداد کرے۔ اگر جسمانی قوت اور طاقت رکھتا ہے۔ تو کمزوروں کی مدد کرے۔ اور مریضوں کی تیمارداری کرے اگر شیریں کلامی کا وصف ہے تو غمزدوں کو تسلی اور دل شکستہ کو حوصلہ دینے کا کام کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ اپنی پاک اور اعلےٰ عملی زندگی سے مثال بن کر دکھلا دے اور فرض منصبی بغیر خیال معاوضہ ادا کرنا اپنا پرم دھرم سمجھے۔

(۶) سرو بھوت ہتکاری ہونا اور لوک سنگرہ (سنگٹھن) کی خواہش میں کوشش کرنا یعنے باہمدگر معاونت ایام جنگ میں ایک ضروری امر ہوتا ہے۔ تاکہ مشترکہ دشمن پر فتحمندی حاصل کی جاوے۔ چونکہ گناہ یا شیطان نہایت زبردست دشمن ہے۔ اس لئے اس کا مقابلہ میں کامیابی تبھی ممکن ہے۔ جبکہ اپنے ہمسائیوں اور اہل ملک کے ساتھ دلی محبت ہو۔ یا کم از کم کسی کے ساتھ دشمنی نہ ہو ؛

(۷) سنیاسیوں کا جوگیا رنگ کا لباس دراصل گیتا کے "یوگ" دھرم کی منادی کرنے والوں۔ "بالفاظ دیگر" مکتی فوج" کے پرچارکوں کی وردی ہے اصلی سنیاس کا تعلق دل سے ہے ؛

(۸) جس شخص نے خود مکتی حاصل نہیں کی۔ وہ نہ صرف دوسروں کو ہی دھرم کے راستے پر لانے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ خود بھی دھرم یدھ میں استقلال سے مٹھیر سکتا۔ اسلیئے ہر ایک سمجھدار کو ایسی بیش قیمت برکت حاصل کرنے کے لئے ہر ایک ممکن وسائل کو کام میں لانا ازبس ضروری ہے۔ مثلاً مکتی کے لئے پرارتھنا کرنا۔ عملی زندگی میں بھگوان کے جیون کا دھیان کرنا اور ان کی تعلیم کا مطالعہ کرنا وغیرہ ⁂

(۹) چونکہ جیون مکت شخص مانا پرکرتی کی گود سے نکل کر پتا پرماتما کی فرمانبرداری کا سبق سیکھتا ہے اس لئے جیسے آدمی کا بیٹا آدمی کہلاتا ہے۔ ویسے ہی وہ پرماتما کا بیٹا ہونے سے روح القدس یا پرماتما کہلاتا ہے بہر حال اسے بندہ دُنیا سے بندہ خدا بننا ضروری ہوتا ہے۔ یعنے ناپاک خواہشات کی بجائے پاک خواہشات کے زیر اثر کام کرنا ضروری ہوتا ہے ⁂

بندۂ دُنیا۔ انسان فطرتاً جو مختلف قسم کے اعمال کرتا ہے ان میں سے کچھ تو ایسے ہوتے ہیں۔ جیسے کہ واقعی اسے کرنے چاہئیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو کہ نہ صرف اس کے لواحقین یا معاصرین کو ہی نقصان دہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کے لئے یا آئندہ نسلوں کے لئے بھی مضر ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اول الذکر اگر نیک کہے جاتے اور دھرم کے نام سے موسوم ہوتے ہیں تو آخر الذکر گناہوں کی فہرست میں جگہ پاتے اور ادھرم یا بدی کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ملے جلے کام کرنے والے شخص کو بندۂ دُنیا اور خود غرضی کی بدولت بندۂ نفس نام دیا جاتا ہے ⁂

دیواسر سنگرام۔ جب اس کا تجربہ وسیع ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ نہ صرف بزرگوں یا معاصرین کی طرف سے ہی اس کے بُرے اعمال کے لئے

تنبیہ یا سرزنش ہوتی ہے۔ بلکہ دور اندیشی اور ہمدردی کے پیدا ہونے پر اسے اپنے اندر سے بھی اپنی اور دوسروں کی تکلیف کا خیال خاص حد تک برے اعمال کرنے میں سدِ راہ ہوتا ہے۔ لہٰذا علاوہ خوف و عبرت کے اس کے دل میں بھی ایک قسم کی جد و جہد شروع ہو جاتی ہے جس میں نفس پرستی کی خواہش تو خاص عمل کے لئے تحریک کرتی ہے اور دوسروں کی خوشی کا خیال اس کے برخلاف رکاوٹ کا موجب ہوتا ہے۔ (اسی کشمکش کو دیواسر سنگرام کہا جاتا ہے) جس سے بعض اوقات وہ ایسا بے چین ہو جاتا ہے کہ زندگی سے بیزار ہو کر خودکشی تک کر بیٹھتا ہے ؛

(چونکہ حیوانی خواہشات پہلے ظہور پکڑتی ہیں اور زوردار ہوتی ہیں۔ بمقابلہ اخلاقی خواہشات کے۔ اس لئے دیوتاؤں سے اسر بڑے بھائی کہے جاتے ہیں ؛

بندۂ خدا ۔ بہرحال جب عادت کے زیر اثر نیک اعمال مرغوب طبع ہو جاتے ہیں اور برے اعمال طبعاً مکروہ بن جاتے ہیں۔ یعنے باوجود تکلیف کا باعث ہونے کے بھی نیکی کو پسند کیا جاتا ہے اور موجب راحت ہونے پر بھی بدی سے نفرت کی جاتی ہے اس حالت میں انسان اصلی معنوں میں دھرماتما یا بندہ خدا کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی خوشنودی کو محض خدا کے لئے ہی چاہتا ہے نہ کہ نفس کے لئے۔ بمصداق ؎

لب آشنائے دعا ہوں نہ ماسوا کیلئے - پکاریئے جو خدا کو تو بس خدا کیلئے

بس یہی جیون مکتی کا سروپ ہے۔ یہی انسان کا معراج اعلےٰ ہے۔ یہی بھگوان کرشن کی تعلیم کا سار ہے۔ یہی گیتا کا تتو یا فلسفہ نجات ہے ؛

(ادم شسم)

کتاب ہذا کے مصنف کی دیگر تصنیفات کی نسبت چند ایک عالم اصحاب کی رائیں ذیل میں نذر ناظرین کی جاتی ہیں۔

سیم درشن بمعروف فلسفہ اعتدال

(۱) شریان بھائی پرمانند جی ایم اے (جن کی علمیت اور حب الوطنی شہرہ آفاق ہے) یوں رقمطراز ہیں:۔

"فلسفہ اعتدال" ڈاکٹر چونی لال صاحب کی تصنیف جو کہ چار مختلف حصوں پر منقسم ہے ایسی کتاب ہے جسمیں زندگی کے متعلق نہایت اہم اور گہرے مضامین پر بڑی عالمانہ طور پر بحث کیگئی ہے۔ میں نے اس کتاب کی جلدوں پر سرسری نظر ڈالنے سے محسوس کیا ہے کہ اس کے دلائل بالکل نئے اور نہایت دلچسپ طریقے پر بیان کئے گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک پڑھے لکھے شخص کو اسکا مطالعہ کرکے ان سے مستفید ہونا چاہیے:

(۲) رائے صاحب لالہ رگھونا تھ سہائے جی بی ٹی ہیڈ ماسٹر دیال سنگھ ہائی سکول لاہور و فیلو پنجاب یونیورسٹی تحریر فرماتے ہیں:۔ میں نے "فلسفہ اعتدال" مصنفہ ڈاکٹر چونی لال صاحب چتین کو مختلف مقامات سے دیکھا اس مفید کتاب کے چاروں حصوں میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے تقریباً ہر ایک دینی دنیاوی۔ اخلاقی اور جسمانی اصول پر بہت متانت و عالمانہ طور پر بحث کی ہے۔ میں حیران ہوں کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس قدر ضروری اور مفید باتوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ کتاب کیا ہے نصیحت اور قیمتی باتوں کا خزانہ ہے۔ کتاب سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے انسان کی روحانی۔ جسمانی اور اخلاقی بناوٹ کا کس قدر گہرا مطالعہ کیا ہے۔ بہت سے دقیق مسائل کو مصنف نے نہایت آسان اور عام فہم عبارت میں ظاہر کیا ہے:

بلحاظ عبارت آرائی بھی یہ کتاب اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب اردو سنسکرت اور ہندی کی اعلیٰ لیاقت رکھتے ہیں۔ ہر چہار حصص میں لائق مصنف نے اپنے و دیگر شاعروں اور مذہبی بزرگوں کے اشعار اور دوہے وغیرہ دئے ہیں۔

ان سے اس کتاب کی خوبی دوبالا ہوگئی ہے۔ مجھے نہایت خوشی ہے کہ پنجاب ٹیکسٹ بک
کمیٹی کی سفارش پر پنجاب گورنمنٹ نے اس کتاب کے مصنف کو انعام عطا فرما کر قدر افزائی کی
ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ پبلک خاصکر ہندو پبلک اس کتاب کی پوری قدر کریگی۔ کیونکہ
مصنف نے فلسفہ کو محض خیال کے دائرہ سے نکال کر عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے اور
اس عملی فلسفہ کی ہر فرد بشر کو ضرورت ہے۔ میں تہ دل سے چاہتا ہوں کہ فلسفہ اعتدال کو
لوگ اچھی طرح سے سمجھیں۔ کیونکہ اعتدال زندگی کیلئے نہایت ضروری چیز ہے۔ میں لائق
مصنف کو اس نہایت ہی مفید تصنیف پر تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ پرماتما کرے۔
پبلک اس مفید کتاب کی قدر کرے۔ اور لائق مصنف کی کوششوں کی داد دے ؛

(۳) شری سوامی پرکاشانند جی سرسوتی (جو کہ سناتن دھرم پرتی ندھی سبھا پنجاب
کیطرف سے پچھلے ہر دوار کمبھ پر گئے تھے) لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر چونی لال صاحب چھبّر کی
مصنفہ کتاب "فلسفہ اعتدال" میری نظر سے گذری۔ لائق مصنف نے اپنے ہی لفظوں
میں افراط و تفریط پر مائل ہندوستانی لوگوں کو سطح اعتدال پر لانے کے لئے یہ تصنیف
خضر طریقت کا کام دیگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ہندو
قوم آجکل جن دو امراض کا شکار ہو رہی ہے انہیں تشخیص کی نظر سے دیکھنا اور نسخہ تجویز
کرنا کسی کار حکیمانہ تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے صرف جسمانی بلکہ روحانی مرضوں کو بھی
جانچ کر "فلسفہ اعتدال" کی صورت میں ایسی دوا تجویز فرمائی ہے۔ جو بشرط استعمال
بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ سائنس اور مذہب کی معرکۃ الآرا بحث کو جسطرح اس کتاب
میں لکھا گیا ہے اور جو جو موشگافیاں مختلف اعتقادات مذاہب عالم کے متعلق اس
تصنیف میں میری نظر سے گذری ہیں۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے میں بلا مبالغہ کہہ سکتا
ہوں کہ ہماری موجودہ حالت میں یہ کتاب ہمیں بہت کچھ سکھلا سکتی ہے۔ مگر علوم
مشرقیہ و مغربیہ کی تعلیم میں رنگے ہوئے اصحاب اس کتاب کی اصلیت کو جلد سمجھ سکینگے

مگر مبتدی اصحاب کے لئے بھی یہ کتاب اتنی ہی مفید ہوسکتی ہے جتنی کم از کم مجھے فائدہ بخش ہوئی ہے۔ مختصراً دنیاوی و دینی ہر دو نقطۂ خیال سے کتاب ہذا قابل دید ہی نہیں قابل عمل بھی ہے۔ علوم مغربی کے لٹو اگر مشرقی کھنڈرات میں مغربی موشگافیوں کو دیکھنا چاہیں تو شوق سے اس کتاب کو ملاحظہ کر سکتے ہیں:

(۴) شری سوامی شردھانند جی سنیاسی مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار خیالات فرماتے ہیں:
"میرے پیارے ڈاکٹر چونی لال جی! نمستے۔ آپ نے اردو داں پبلک پر یہ کتاب تیار کر کے احسان کیا ہے۔ پرمیشور کرپا کرے۔ کہ پڑھنے والے اس سے وہ فائدہ اٹھائیں جس کے لئے آپ نے اتنا پریشرم کیا ہے":

(۵) لالہ دیوان چند ایم اے (پرنسپل ڈی اے وی کالج کانپور) تحریر فرماتے ہیں:-
"میں نے ڈاکٹر چونی لال جی کے فلسفہ اعتدال کا بہت سا حصہ پڑھا ہے۔ جس دلی شوق اور محنت سے انہوں نے اس کتاب کو لکھا ہے اس کیلئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں جسمانی اور روحانی صحت کے متعلق بہت سی ہدایات اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں۔ جن لوگوں کو فلسفہ کے مطالعہ کا شوق ہے ان کے لئے فلسفۂ اعتدال دلچسپ اور مفید مطالعہ ثابت ہوگا":

(۶) اخبار ہندوستان لاہور کا ریویو:- فلسفہ اعتدال ڈاکٹر چونی لال صاحب چیتن کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں۔ جن میں علوم ظاہری و باطنی کا عطر نکال کر رکھ دیا ہے۔ مصنف کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ حفظان صحت کے مستند اصولوں سے لیکر آتمک ودیا اور یوگ وگیان کے مسائل تک بحث کی گئی ہے۔ محض شاستروں کے سرسری مطالعہ سے تو اسقدر واقفیت ہونی مشکل ہے۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ مصنف نے کسی مہاتما کا ست سنگ کیا ہے۔ اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ مغربی سائنس نے جو کچھ دریافت کیا، وہ شاستر انکول ہے۔ نہایت ہی قابل قدر کتاب ہے:

(۷) رسالہ "روشنی" لاہور کا ریویو:۔ فلسفہ اعتدال نامی کتاب مصنفہ ڈاکٹر چونی لال صاحب جین اپنی قسم کی پہلی کتاب ہونے کے علاوہ ایک نہایت مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے ہر ایک دنیاوی۔ اخلاقی۔ دماغی اور روحانی پہلو کے متعلق دقیق مسائل پر نہایت اعلیٰ طریقے پر بحث کی ہے۔ سائینس کے اصولوں کو نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ خاصکر مسئلہ ترقی تدریج (ایوولیوشن) کے متعلق جو بحث کی گئی ہے وہ نہایت اعلیٰ ہے۔ پبلک کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید ہونا چاہئے:

(۸) لالہ آنندسین صاحب بی اے وکیل (کسولی):۔ واقعی کتاب قابل دید ہے:

(۹) ڈاکٹر گھسیٹا رام صاحب (کالکا):۔ میں نے فلسفہ اعتدال کو غور سے پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اعلیٰ علمی لیاقت اور وسیع معلومات اور مطالعہ کے بے انتہا بحر کو کوزہ میں بند کر کے دکھایا ہے:

(۱۰) لالہ بینی پرشاد صاحب ایم ایس سی (گورنمنٹ کالج لاہور):۔ آپ کی حیرت انگیز تصنیف کی حقیقی خوبی کا ہمیشہ مداح رہونگا:

(۱۱) دیوان دوارکا داس جی ریٹائرڈ مجسٹریٹ پٹیالہ:۔ جناب کی تصنیف کو میں نے پڑھا۔ واقعی انسان کے خیالات اور زندگی سدھارنے کیلئے ایک بےنظیر چیز ہے:

(۱۲) سودھی موہن سنگھ جی ریٹائرڈ انجینئر پٹیالہ:۔ فلسفہ اعتدال کے مطالعہ سے مجھے بہت ہی فائدہ پہنچا ہے:

(۱۳) لالہ کانشی رام جی ریٹائرڈ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لدھیانہ:۔ ہر ایک لائبریری میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ کیونکہ جسمانی اور روحانی مسائل کی نسبت صحیح واقفیت پہنچاتی ہے:

(۱۴) پنڈت منوہر ناتھ صاحب وزیر وزارت کشمیر:۔ فلسفہ اعتدال کو میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اور مستفید ہوا ہوں۔ اس کتاب کی جتنی تعریف کیجائے کم ہے:

ایسے ہی اور بہت سے خطوط جو "فلسفہ اعتدال" کی تعریف سے بھرے ہوئے ہیں دیگر علم دوست ناظرین کی طرف سے آچکے ہیں۔ لیکن ان کو درج کرنے سے ہم بخوف طوالت معذور ہیں۔

کتاب ہذا کی ضخامت ۲۲×۱۸/۸ کے تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحے۔ کاغذ نفیس لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت صرف ڈھائی روپے (عہ) علاوہ محصولڈاک۔

پریم درشن المعروف فلسفۂ اتحاد }

مسٹر رام رچھپال سنگھ شیدا دہلوی کی طرف سے اخبار "ہندو" لاہور میں ریویو:۔ ڈاکٹر جیوتی لال صاحب جین مہتمم شفاخانہ پنجاب مشن ہاسپٹل لاہور نے ایک نیا فلسفہ دنیا کے سامنے فلسفہ اتحاد کے نام سے پیش کیا ہے۔ جس کو تین جلدوں میں قلمبند کیا ہے۔ بڑے بڑے اہل نظر اور علم دوست اصحاب نے اس تصنیف کی داد دی ہے۔ مدت کے بعد ایسی عالمانہ کتاب کسی ہندوستانی کی تصنیف سے ہندوستانی زبان میں نظر سے گزری ہے۔ مصنف کے مطالعہ کی وسعت اس سے عیاں ہے کہ مشرق اور مغرب کے مختلف فلسفوں کے حوالے سے ہر ایک دعوے کی دلیل دی ہے۔ سائنس کی قدیم اور جدید دریافتوں پر نظر رکھتے ہوئے نہایت دقیق مسائل کو حل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اعتدال کو اعلیٰ مقصد ثابت کرکے خدمت انسان کو ہی زندگی کا منتہا مقصود قرار دیا گیا ہے۔ کپل اور پاتنجل سوتروں سے لیکر کینٹ اور ہربرٹ سپنسر اور ڈاروِن کے اصولوں پر بحث کرکے وحدت وجود کو ثابت کیا گیا ہے۔ ذات باری کے متعلق نہایت حکیمانہ استدلال کے علاوہ اقتصادیات اور سیاسیات پر بھی نہایت بالغ نظری سے گفتگو کی گئی ہے۔ زبان نہایت فصیح و بلیغ۔ فقروں کی بندش برجستہ۔ اور تحریر میں سلاست و روانی کے علاوہ ہر علم و فن کی صحیح اصلاحات سے کام لیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی نہایت اختصار کو ہر جگہ مدنظر رکھا ہے ورنہ یہ بحث کئی ہزار صفحوں میں بھی ختم نہ ہوتی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہر شخص کے مطالعہ میں آنی

چاہیئے - کیونکہ تھوڑی علمیت رکھنے والوں کی سمجھ میں یہ خیالات نہیں آسکتے - ہاں جن کو فلسفہ سے مَس ہے ان کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہے ؛

(۳) رسالہ رفیق التعلیم لاہور :- بہی خواہان ہند کو ممنون ہونا چاہئے ڈاکٹر چمنی لال صاحب جیتین کا - کہ آپ نے اس زمانہ میں جبکہ باشندگان ہند کے کشیدہ جذبات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ مصنفین اپنی خداداد قابلیت کو اتحاد شکن لٹریچر پیدا کرنے میں صرف کرکے گناہ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں - ایک ایسی تصنیف پبلک کے روبرو پیش کی ہے جو نہ صرف ہندوستان والوں کے لئے ہی اتحاد کا سبق دیتی ہے - بلکہ تمام دنیا کو ایک صراط مستقیم دکھاتی ہے - جسے پکڑ کر عالمگیر امن و امان کی طرف قدم بڑھایا جاسکتا ہے - فلسفہ اتحاد کے مصنف ایک ایسی فلسفیانہ طبعیت اور ایک ایسے فصیحانہ انداز بیان کے مالک ہیں - کہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو نہایت واضح اور سریع الفہم بنادیتے ہیں - ان کی پہلی تصنیف فلسفہ اعتدال خواص و عام سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے - اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب فلسفہ اتحاد بھی مقبول نہ ہو - ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں - کہ اس سے قبل کسی شخص نے اس نازک اور اہم مسئلہ پر ڈاکٹر صاحب کی مانند عالمانہ بحث نہیں کی - اور ہمارا خیال ہے کہ کوئی شخص بھی جو اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھیگا - ڈاکٹر صاحب کے دلائل و براہین کا قائل ہوئے بغیر نہ رہے گا - یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے - اور ہر ایک حصے کی ضخامت تقریباً ۳۲۵ صفحات ہے - پہلے حصہ میں انسانیت کے معراج اور اس کے ذرائع تحصیل کو بہ طریق اثبات بالتفصیل بیان کیا گیا ہے - دوسرے حصہ میں فلسفہ مذہب علم مثال - مسئلہ کلام (جس میں علم معانی - علم بیان - اور علم بدیع شامل ہیں) علم استدلال - مسئلہ اعمال اور مسئلہ عشق پر بحث کی گئی ہے - اور تیسرے حصے میں مسئلہ عرفان اور مسئلہ قومیت پر بحث کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ جسطرح اہل موسیقی سات

سُروں کو ہم آہنگ کرکے مست کرنے والے راگ نکالتے ہیں۔ اسی طرح مختلف العقیدہ لوگوں میں بھی اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مصنف کا عقیدہ ہے کہ جہاں ایک طرف کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں کہی جا سکتی کہ جو فطرت انسانی کے کسی خاص درجہ ترقی کے لحاظ سے نور صداقت اپنے اندر مخفی نہ رکھتی ہو۔ وہاں دوسری طرف کوئی مذہبی رہنما بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کی زندگی شاندار نفس کشی کے واقعات اور عملی ہدایات کا گنجینہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے مخالف عقیدہ رکھنے والوں کی نکتہ چینی کرنا بہت آسان ہے۔ اور باوجود اختلاف رکھنے کے اتحاد کے مقامات ڈھونڈ نکالنا نہایت مشکل۔ لیکن یہی ایک وہ اہم کام ہے۔ جو دنیا میں حقیقی امن و امان قائم کر سکتا ہے۔ اور جسے اختیار کرکے انسان آپس میں پریم اور ہمدردی سے زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے معراج پر پہنچنے کی متفقہ کوشش کر سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین رفیق اس کتاب سے ضرور مستفید ہونگے۔ اور نہ صرف مصنف کی محنت کی داد دینگے۔ بلکہ اس پیغام کو قبول کرینگے۔ جسے اس کتاب کے ذریعہ اوروں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں سخت افسوس ہے کہ اس نادر تصنیف پر ریویو کرنے میں غیر معمولی دیر ہو گئی۔ جس کے لئے ہم قابل مصنف سے معافی کے خواستگار ہیں :

اسی طرح اور بھی بہت سی رائیں درج کی جا سکتی ہیں۔ لیکن بمصداق عاقلاں را اشارہ کافی ست۔ ہم نے مشتے نمونہ از خروارے کے اصول پر اختصار سے کام لینا ہی بہتر سمجھا ہے۔ ع :- در خانہ گر کس ست تو یک حرف بس است۔ کتاب مذکورہ بالا کے تین حصے ہیں اور ہر ایک حصے کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے علاوہ محصولڈاک۔ لیکن جو اصحاب فلسفہ اعتدال اور فلسفہ اتحاد کے تمام حصوں کی یکدم خریداری پسند فرمائیں گے ان کو محصولڈاک معاف کیا جائیگا :

By the same Auther.

رام بھگتی کا تتو	0 2 0
عالمگیر سناتن دھرم کا مہتو	0 2 0
پورانوں کا تتو	0 2 0
مورتی پوجا اور سائینس	0 4 0

and many others.

کرشن بھگتی کا تتو ...... 0 – 2 – 0

Can be had from—

شری کرشن گٹکا بکڈپو لاہور

Title page only Printed at The Master Press, Lahore.

60